

داستان مجاہد

نسیم حجازی



فہرست

05	صابرہ
14	عذرا
28	بچپن
41	مکتب
57	ایثار
75	دوسرا راستہ
101	اسیری
134	اجنبی
151	فاتح
170	زرگس
205	سفیر
223	نیا دور
235	اژدہا شیروں کے نرغے میں
266	جزا اور سزا
279	آخری فرض

پیش لفظ

”داستانِ مجاہد“ کی ابتدا ایک افسانے سے ہوئی ۱۹۳۸ء میں ’مجاہد‘ کے عنوان سے ایک افسانے کا پس منظر تلاش کرنے کی غرض سے میں نے تاریخِ اسلام اٹھائی۔ مجھے داستانِ ماضی کا ہر صفحہ ایک دل کش افسانہ نظر آیا۔ اس رنگین داستان کی جاؤ بیت نے افسانہ لکھنے کے ارادے کو تاریخِ اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے شوق میں تبدیل کر دیا۔

ایک مدت تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ تاریخِ اسلام کے کس واقعے کو اپنے افسانے کی زینت بناؤں۔ میں کسی ایک پھول کی تلاش میں ایک ایسی سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ چکا تھا جس کی آغوش میں رنگا رنگ کے پھول مہک رہے تھے۔ دیر تک میری نگاہیں اس دلفریب وادی میں بھٹکتی رہیں اور میرے ہاتھ ایک پھول کے بعد دوسرے پھول کی طرف بڑھتے رہے۔ میں رنگا رنگ پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا۔ آج میں ان پھولوں کو ایک گلدستے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر اس گلدستے کو دیکھ کو ہمارے نوجوانوں کے دلوں اس وادی کی سیاحت کا شوق اور اپنے خزاں رسیدہ چمن کو اس وادی کی طرح سرسبز و شاداب بنانے کی آرزو پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی محنت کا پھل مل گیا۔

ادب برائے کانعرہ بلند کرنے والے حضرات شاید میری اس کاوش پر برہم ہوں لیکن میں ادب کو محض تضحیق اوقات اور ذہنی امتیاز کا ذریعہ بنانے کا قائل نہیں۔ نظامِ کائنات میں ایک غایت درجہ کا توازن ہماری زندگی کے کسی فعل کو بے مقصد ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔

ہر قوم کی تعمیر نو میں اس کی تاریخ ایک اہم حصہ لیتی ہے۔ تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جو کو سامنے رکھ کر قومیں اپنے ماضی و حال کا موازنہ کرتی ہیں۔ اور یہی ماضی اور حال کا موازنہ ان کے مستقبل کا راستہ تیار کرتا رہتا ہے۔ ماضی کی یاد مستقبل کی امنگوں میں تبدیل ہو کر ایک قوم کے لیے ترقی کا زینہ بن سکتی ہے اور ماضی کے روشن زمانے پر بے علمی کے نقاب ڈالنے والی قوم کے لیے مستقبل کے راستے بھی تاریک ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے ماضی کی داستان دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ سے زیادہ روشن ہے۔ اگر ہمارے نوجوان غفلت اور جہالت کے پردے اٹھا کر اس روشن زمانے کی معمولی سے جھلک بھی دیکھ سکیں تو مستقبل کے لیے انہیں ایک ایسی شاہراہ عمل نظر آئے گی جو کہکشاں سے زیادہ درخشاں ہے۔

موجودہ دور کے فتونِ لطیفہ نے کسی ٹھوس مضمون کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمارے نوجوانوں کی صلاحیت سلب کر لی ہے۔ میرے نزدیک موجودہ ادب میں ناول اور افسانے کی مدد سے زندگی کے اہم اور ٹھوس مسائل کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

”داستانِ مجاہد“ ایک ناول ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا پہلا ناول فنی اعتبار سے کس حد تک کامیاب ہے۔ لیکن جہاں تک دل چسپی کا تعلق ہے میں اپنی ادبی صلاحیتوں سے زیادہ تاریخِ اسلام کی رنگینی کو اس کا ضامن سمجھتا ہوں۔

(نسیم حجازی)

کوئٹہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۳ء

صابرہ

سُورج کئی بار مشرق سے نکل کر مغرب سے غروب ہوا۔ چاند نے اپنے مہینے بھر کا سفر ہزاروں بار طے کیا۔ ستارے لاکھوں بار رات کی تاریکی میں چمکے اور صبح کی روشنی میں غائب ہو گئے۔ ابنِ آدم کے باغ میں کئی بار بہار اور خزاں نے اپنا اپنا رنگ جمایا۔ جنت سے نکالے ہوئے انسان کی نئی بستی ایک ایسی رزم گاہ تھی جس میں فطرت کے مختلف عناصر ہمیشہ برسرِ پیکار رہے۔ طرح طرح کے انقلابات آئے۔ تہذیب و تمدن نے کئی چولے بدلے۔ ہزاروں قومیں قعرِ مذلت سے اٹھیں اور آندھی اور بگولہ بن کر ساری دنیا پر چھا گئیں لیکن قانونِ فطرت میں کمال اور زوال کا رشتہ ایسا مضبوط ہے کہ کسی کو بھی ثبات نہیں۔ وہ قومیں جو تلواروں کے سائے میں فتح کے نقارے بجاتی ہوئی اٹھیں، طاؤس اور رباب کی تانوں میں مدہوش ہو کر سو گئیں۔ کوئی اس نیلگوں آسمان سے پوچھے جس کے وسیع سینے پر گزرے ہوئے زمانے کی ہزاروں داستانیں نقش ہیں۔ جس نے قوموں کو بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ جن نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کو تاج و تخت سے محروم ہو کر گداؤں کا لباس پہنتے اور گداؤں کو اپنے سر پر تاج رکھتے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان داستانوں کے بار بار دہرائے جانے سے کچھ بے نیاز ہو گیا ہو لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ صحرا نشینانِ عرب کی ترقی اور تنزل کی طویل داستان جو ربع مسکوں کی تمام داستانوں سے مختلف ہے، اسے ابھی تک یاد ہوگی۔ اگرچہ اس داستان کا کوئی حصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے سامنے اس کا وہ رنگین باب ہے جب کہ مغرب و مشرق کی وادیاں، پہاڑ اور صحرا مسلمانوں کے سمندرِ اقبال کے قدم

پُوم رہے تھے اور ان کی خارا شگاف تلو اروں کے سامنے ایران اور روما کے سلطان عاجز آ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جن کہ ترکستان اندلس اور ہندوستان کی سر زمین مسلمانوں کو قوتِ تسخیر کے امتحان کی دعوت دے رہی تھی۔

بصرہ سیکوئی بیش میل کے فاصلے پر سرسبز و شاداب نخلستان کے درمیان ایک چھوٹی سے بستی تھی، جس کے ایک سیدھے سادے مکان کے صحن میں صابرہ، ایک ادھیڑ عمر کی عورت عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ دوسری طرف تین بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی، لڑکوں نے ہاتھوں میں لکڑی کی دو چھوٹی چھوٹی چھڑیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ لڑکی غور سے ان کے حرکات کا معائنہ کر رہی تھی۔ بڑے لڑکھے نے چھڑی گھماتے ہوئے چھوٹے کی طرف دیکھا اور کہا:

”دیکھو نعیم! میری تلوار!“

چھوٹے لڑکے نے بھی اپنی چھڑی گھمائی اور کہا:

”میرے پاس بھی تلوار ہے۔ آؤ ہم جنگ کریں۔“

”تم رو پڑو گے!“ بڑے لڑکے نے کہا۔

نہیں۔ تم رو پڑو گے! چھوٹے لڑکے نے جواب دیا۔

”تو پھر آؤ!“ بڑے نے تن کر کہا۔

معصوم بچے ایک دوسرے پر وار کرنے لگے اور لڑکی قدرے پریشان ہو کر یہ تماشہ دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کا نام عذرا تھا۔ چھوٹیلو کے کا نام نعیم اور بڑے کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ نعیم سے تین سال بڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن

نعیم کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ واقعی میدانِ کارزار میں کھڑا ہے۔ نعیم وار کرتا اور عبداللہ متانت سے روکتا۔ اچانک نعیم کی چھتری اس کے بازو پر لگی۔ عبداللہ نے قدرے غصے میں آکر وار کیا۔ اب نعیم کی کلائی پر چوٹ لگی اور اس کے ہاتھ سے چھتری گر پڑی۔

عبداللہ نے کہا۔ دیکھو اب رونا مت!

میں نہیں، تم رو پڑو گے! نعیم نے غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے جواب دیا اور زمین سے ایک ڈھیلا اٹھا کر عبداللہ کے ماتھے پر دے مارا۔ اس کے بعد اس نے اپنی چھتری اٹھالی اور گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ عبداللہ بھی سر سہلاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا لیکن اتنی دیر میں نعیم صابرہ کی گود میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

امی! بھائی مارتا ہے۔ اس نے کہا

عبداللہ غصے سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ لیکن ماں کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

ماں نے پوچھا۔ عبداللہ! کیا بات ہے؟

اس نے جواب دیا۔ امی! اس نے مجھے پتھر مارا ہے۔

تم لڑے کیوں تھے بیٹا؟ صابرہ نے نعیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

ہم تلواروں سے جنگ کر رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ توڑ دیا۔ پھر میں نے بھی بدلہ لیا۔

تلواروں سے؟ تلواریں تم کہاں سے لائے؟

یہ دیکھو امی! نعیم نے اپنی چھٹری دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ لکڑی کی ہے لیکن مجھے لو ہے کہ تلوار چاہیے۔ لے دو نا، میں جہاد پر جاؤں گا!

کم سن بیٹے کے منہ سے جہاد کا لفظ سننے کی خوشی وہی مائیں جان سکتی ہیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو لوری دیتے وقت یہ گایا کرتی تھے

”اے رب کعبہ! میرا یہ لال مجاہد بنے اور تیرے محبوب کے لگائے ہوئے درخت کو جوانی کے خون سے سیراب کرے“

نعیم کی زبان سے تلوار اور جہاد کے الفاظ سن کر صابرہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس کی رگ وریشہ میں مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس نے فرط انبساط سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ماضی اور حال کو فراموش کر چکی تھی اور تصویر میں اپنے بیٹوں کو نو جوان مجاہدوں کے لباس میں خوبصورت گھوڑوں پر سوار میدان جنگ میں دیکھ رہی تھی۔

وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے لال دشمن کی صفوں کو چیرتے اور روندتے ہوئے جا رہے ہیں اور دشمن کے گھوڑے اور ہاتھی ان کے بے پناہ حملوں کی تاب نہ لا کر آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ اس کے نو جوان بیٹے ان کے تعاقب میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریاؤں میں گھوڑے ڈال رہے ہیں۔ وہ دشمن کے نرے میں کئی بار اٹھ اٹھ کر گرتے ہیں اور بالآخر زخموں سے نڈھال ہو کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جنت کی حوریں ان کے لیے شراب ٹھہور کے جام لیے کھڑی ہیں۔ صابرہ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور سجدے میں سر رکھ کر دعا مانگی۔

”اے زمین و آسمان کے مالک! جب مجاہدوں کی مائیں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں تو کسی سے پیچھے نہ رہوں گی۔ ان بچوں کو اس قابل بنا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو قائم رکھ سکیں۔“

دُعا کے بعد صابرہ اٹھی اور بچوں کو گلے لگالیا۔

انسانی زندگی کی ہزاروں واقعات ایسے ہیں جو عقل کی محدود چار دیواری سے گزر کر مملکتِ دل کی لاکھ دو سعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم دنیا کے ہر واقعہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں تو ہمارے لیے بعض اوقات نہایت معمولی باتیں بھی طلسم بن کر رہ جاتی ہیں۔ ہم دوسروں کے احساسات و جذبات کا اندازہ اپنے احساسات و جذبات سے کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی وہ حرکات جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں ہمارے لیے ایک معما بن جاتی ہیں۔ آج کل کی ماؤں کو قرونِ اولیٰ کی ایک بہادر ماں کی تمنائیں اور دُعاؤں کس قدر عجیب معلوم ہوں گی۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آگ اور خون میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کی آرزو انہیں کس قدر بھیا نک نظر آتی ہوگی اپنے بچوں کو بلی کا خوف دلا کر سلانے والی مائیں ان کے متعلق شیروں کے مقابلے میں کھڑے ہونے کا خواب کب دیکھتی ہوں گی!۔

ہمارے کالجوں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں پلے ہوئے نوجوانوں کا علم اور عقل پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کو خاطر میں نہ لانے والے مجاہدوں کے دلوں کا راز کیسے جان سکتی ہے۔ رباب کے تاروں کی جنبش کے ساتھ لرز جانے والے نازک مزاج انسانوں کو تیر اور نیزوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے والے جواں مردوں کی داستانیں کس قدر حیرت زا معلوم ہوں گی۔ اپنے گھونسلے کے ارد گرد چکر لگانے والی چڑیا عقاب کے انداز پر واز کس طرح واقف ہو سکتی ہے!

(۲)

صابرہ کا بچپن اور جوانی زندگی کے ناہموار ترین راستوں سے گزر چکے گے۔ اس کے رگ وریشہ میں عرب کے ان شہسواروں کا خون تھا جو کفر و اسلام کی ابتدائی جنگوں میں اپنی تلواروں کے جوہر دکھا چکے تھے۔ ان کا دادا جنگِ یرموک سے غازی بن کر لوٹا اور قادیسیہ میں شہید ہوا۔ وہ بچپن ہی سے غازی اور شہید کے الفاظ سے آشنا تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب وہ پانی تو تلی زبان سے ابتدائی حروف ادا کرنے کی کوشش کیا کرتی تو اس کی ماں کا سکھلایا ہوا پہلا فقرہ ابا غازی اور چند دنوں کے بعد کا سبق ابا شہید تھا۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے کے بعد اس کی جوانی اور بڑھاپے سے ہر وہ توقع کی جاسکتی تھی جو ایک مسلمان فرض شناس عورت سے وابستہ کی جاسکتی ہے۔ وہ بچپن میں عرب عورتوں کی شجاعت کے افسانے سنا کرتی تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس کی شادی عبدالرحمن کے ساتھ ہوئی۔ نوجوان شوہر ایک مجاہد کی تمام خوبیوں سے آراستہ تھا اور وفا شعار بیوی کی محبت اسے گھر کی چار دیواری میں بند کر دینے کی بجائے ہمیشہ جہاد کے لیے ابھارتی رہی۔

عبدالرحمن جب آخری مرتبہ جہاد پر روانہ ہوا تو اس وقت عبداللہ کی عمر تین سال اور نعیم کی عمر تین مہینے سے کچھ کم تھی۔ عبدالرحمن نے عبداللہ کو اٹھا کر گلے لگالیا اور نعیم کو صابرہ کی گود سے لے کر پیار کیا۔ چہرے پر قدرے ملال کے آثار پیدا ہوئے لیکن فوراً ہی مسکرانے کی کوشش کی۔ رفیقِ حیات کو میدانِ جنگ کی طرف رخصت ہوتا دیکھ کر صابرہ کے دل میں تھوڑی دیر کے لیے طوفان سا اٹھ آیا لیکن اس نے اپنی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو بہنے کی اجازت نہ دی۔

عبدالرحمن نے کہا۔ صابرہ! مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر میں جنگ سے واپس نہ آیا تو میرے بیٹے میری تلوروں کو زنگ آؤ ورنہ ہونے دیں گے!

آپ تسلی رکھیں۔ صابرہ نے جواب دیا۔ میرے لال کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ عبدالرحمن نے خدا حافظ کہہ کر گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا۔ صابرہ نے اس کے رخصت ہونے کے بعد سجدے میں سر رکھ کر دُعا کی:

اے زمین و آسمان کے مالک! اسے ثابت قدم رکھنا!

جب شوہر اور بیوی صورت اور سیرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے قابل رشک ہوں تو محبت کے جذبات کا کمال کی حد تک پہنچ جانا کوئی نئی بات نہیں بیشک صابرہ اور عبدالرحمن کا تعلق جسم اور روح کا تعلق تھا اور رخصت کے وقت لطیف جذبات کو اس طرح دبا لینا کسی حد تک عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ کونسا عظیم الشان مقصد تھا جس کے لیے یہ لوگ دنیا کی تمام خواہشات اور تمناؤں کو قربان کر دیتے تھے؟ وہ کونسا مقصد تھا جس نے تین سو تیرہ کو ایک ہزار کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا تھا؟ وہ کونسا جذبہ تھا جس نے مجاہدوں کو دریاؤں اور سمندروں میں گودنے، تپتے ہوئے وسیع صحروں کو عبور کرنے اور فلک بوس پہاڑوں کو روندنے کی قوت عطا کی تھی؟

ان سوالات کا جواب ایک مجاہد ہی دے سکتا ہے۔

عبدالرحمن کو رخصت ہوئے سات مہینے گزر چکے تھے۔ اس بستی کے چار اور آدمی بھی اس کی ہمراہ گئے تھے۔ ایک دن عبدالرحمن کا ایک ساتھی واپس آیا اور اونٹ سے اترتے ہی صابرہ کے گھر کی طرف بڑھا۔ اس کے آتے ہی بہت سے لوگ اس

کی ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے عبدالرحمن کے متعلق پوچھا۔ نوور د نے کوئی جواب نہ دیا اور پچپ چاپ صابرہ کے مکان میں داخل ہو گیا۔

صابرہ نماز کے لیے وضو کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھی۔ نووار د آگے بڑھا اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

صابرہ نے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر پوچھا:

وہ نہیں آئے؟

وہ شہید ہو گئے۔

شہید! ضبط کے باوجود صابرہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بہہ نکلے۔ نووار د نے کہا۔ اپنے آخری لمحات میں جب وہ زخموں سے چُور تھے۔ انہوں نے یہ خط مجھے اپنے خون سے لکھ کر دیا تھا۔

صابرہ نے اپنے شوہر کا آخری خط کھول کر پڑھا:

صابرہ! میری آرزو پوری ہوئی۔ اس وقت جب کہ میں زندگی کے آخری سانس پورے کر رہا ہوں۔ میرے کانوں میں ایک عجیب راگ گونج رہا ہے۔ میری رُوح جسم کی قید سے آزاد ہو کر اس راگ کی گہرائیوں میں کھو جانے کے لیے پھڑپھڑا رہی ہے۔ میں زخموں سے چُور ہونے کے باوجود ایک فرحت سی محسوس کرتا ہوں۔ میری رُوح ایک ابدی سرور کے سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔ میں اس بستی کو چھوڑ کر ایک ایسی دنیا میں جا رہا ہوں جس کا ہر ذرہ اس دُنیا کی تمام رنگینیاں اپنے پہلو میں لیے ہوئے ہے۔

میری موت پر آنسو نہ بہانا۔ میں اپنے مقصود کو پا چکا ہوں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم سے دُور جا رہا ہوں۔ ہم کسی دن ایسے مقام پر اکٹھے ہوں گے جو دائمی سرور کا مرکز ہے، جہاں کی صبح شام سے اور بہار خزاں سے آشنا نہیں۔ یہ مقام اگرچہ چاند اور ستاروں سے کہیں بلند ہے۔ مگر مرد مجاہد وہاں ایک ہی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ عبد اللہ اور نعیم کو اس مقام پر پہنچ جانے کا راستہ دکھانا تمہارا فرض ہے! میں تمہیں بہت کچھ لکھتا مگر میری رُوح جسم کی قید سے آزاد ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ میں آقائے نامدار کے پاؤں چومنے کے لیے بے تاب ہوں۔ میں تمہیں اپنی تلوار بھیج رہا ہوں۔ بچوں کو اس کی قدر و قیمت بتانا۔ جس طرح میرے لیے تم ایک فرض شناس بیوی تھیں۔ میرے بچوں کے لے ایک فرض شناس ماں بننا۔ مامتا کو اپنے ارادوں میں حائل نہ ہونے دینا۔ انہیں یہ بتانا کہ مجاہد کی موت کے سامنے دنیا کی زندگی بے حقیقت اور ہیچ ہے۔

(تمہارا شوہر)

عذرا

عبدالرحمن کو شہید ہوتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ ایک دن صابرہ اپنے مکان کے صحن میں کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھی عبداللہ کو سبق پڑھا رہی تھی۔ نعیم ایک ڈنڈے کا گھوڑا بنا کر اسے چھڑی سے ہانکتا ہوا ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا۔ کسی نے باہر کے دروازے پر دستک دی۔ عبداللہ نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ماموں جان ماموں جان کہتا ہوا نو وارد سے لپٹ گیا۔

کون سعید! صابرہ نے اندر سے آواز دی۔

سعید ایک کم سن لڑکی کو انگلی سے لگائے صحن میں داخل ہوا۔ صابرہ نے اٹھ کر چھوٹے بھائی کا خیر مقدم کیا اور لڑکی کو پیار کرتے ہوئے پوچھا:

یہ عذرا تو نہیں؟ اس کی شکل و صورت بالکل یاسمین جیسی ہے!

”ہاں بہن یہ عذرا ہے۔ میں اسے آپ کے پاس چھوڑنے آیا ہوں۔ مجھے فارس جانے کا حکم ملا ہے۔ وہاں خارجی بغاوت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں بہت جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ پہلے سوچا تھا کہ عذرا کو کسی کے ساتھ آپ کے پاس بھیج دوں گا مگر پھر یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی یہاں سے ہوتا جاؤں۔“

”یہاں سے کب روانہ ہونے کا ارادہ ہے؟ صابرہ نے پوچھا۔“ آج ہی چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ آج ہماری فوج بصرہ میں قیام کرے گی۔ کل صبح ہم وہاں سے فارس کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

عبداللہ والدہ کے پاس کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ نعیم جو کچھ دیر پہلے ایک لکڑی کی چھڑی کو گھوڑا سمجھ کر دل بہلا رہا تھا، عبداللہ کے پاس آکھڑا ہو گیا۔ سعید نے نعیم کو اٹھا کر گلے لگایا۔ پیار کیا اور پھر ہمیشہ سے باتیں کرنے لگا۔ نعیم پھر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر عبداللہ کے پاس آ گیا اور عذرا کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن حیا کہ وجہ سے خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جرات سے کام لے اور عذرا سے مخاطب ہو کر پوچھا:

تم بھی گھوڑا لوگی؟

عذرا شرم کر سعید کے پیچھے چھپ گئی۔

جاؤ بیٹا! سعید نے عذرا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اپنے بھائی کے ساتھ کھیلو!

عذرا شرماتی ہوئی آگے بڑھی اور اُس نے نعیم کے ہاتھ سے چھڑی پکڑ لی۔ دونوں کے صحن کے دوسری طرف جا کر اپنے اپنے لکڑی کے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔

عبداللہ نعیم کی حرکات سے ناخوش تھا اور اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا لیکن نعیم تھوڑے ہی عرصے میں اپنے نئے ساتھی سے کچھ اس درجے مانوس ہو گیا تھا کہ عبداللہ اس کی طرف دیکھتا بھی تو وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ جب عبداللہ نے اس کو منہ چڑانا شروع کیا تو وہ ضبط نہ کر سکا:

دیکھو امی جان! عبداللہ منہ چڑاتا ہے!

ماں نے کہا۔ نہ عبداللہ اسے کھیلنے دو!

عبداللہ سنجیدہ ہوا تو نعیم نے منہ چڑا کر شروع کیا۔ عبداللہ تنگ آ کر اس طرف سے منہ پھیر لیا۔

(۲)

عذرا کی کہانی صابرہ سے مختلف نہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ہوش سنبھالنے سے پہلے والدین کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عذرا کا باپ ظہیر فسطاط کے سرکردہ لوگوں میں سے تھا۔ اس نے بیس سال کی عمر میں ایرانی نسل کی ایک حسین لڑکی یا سمین سے شادی کی تھی۔

یا سمین کے سہاگ کی پہلی شب تھی۔ وہ اپنے محبوب شوہر کے پہلو میں امنگوں کی ایک نئی دنیا بیدار کر رہی تھی۔ کمرے میں چند شمعیں جل رہی تھیں۔ یا سمین اور ظہرے کی آنکھوں میں خمار تھا لیکن وہ خمار نیند کے خمار سے بہت مختلف تھا۔

ظہیر پوچھ رہا تھا۔ یا سمین! سچ سچ بتاؤ تم خوش ہونا!

ڈلہن نے انتہائی مسرت کی حالت میں بولنے کی بجائے نیم باز آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر جھٹکالیں۔

ظہیر نے پھر وہی سوال کیا۔ یا سمین نے شوہر کی طرف دیکھا، حیا اور مسرت کی گہرائیوں میں کھوئے ہوئے ایک دلفریب تبسم کے ساتھ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بھولا بھالا سا جواب کس قدر معنی خیز تھا۔ اس وقت جب کہ رحمت کے فرشتے مسرت کا گیت گارہے تھے اور یا سمین کا دھڑکتا ہوا دل ظہیر کے دل کی دھڑکن کا

جواب دے رہا تھا۔ الفاظ کس قدر بے حقیقت معلوم ہوتے تھے۔ ظہیر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

اپنے دل سے پوچھو۔ یا سمین نے جواب دیا۔

ظہیر نے کہا۔ میرے دل میں تو آج خوشی کا طوفان اُٹ رہا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کائنات کی ہر چیز مسرت کے نغموں سے لبریز ہے۔ کاش! یہ نغمے ہمیشہ ایسے ہی رہیں۔ کاش! یا سمین کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو ایک لمحہ پیشتر مسرتوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھیں۔ مستقبل کا خیال آتے ہی پُر غم ہو گئیں۔ ظہیر محبوب بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے اختیار سا ہو گیا۔

یا سمین! یا سمین! تم رو پڑیں۔ کیوں؟

نہیں۔ یا سمین نے مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ آنسوؤں میں بھگی ہوئی مسکراہٹ اس کے حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔

نہیں۔ کیوں؟ تم تو سچ مچ رو رہی ہو۔ یا سمین تمہیں کیا خیال آیا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنا میری قوت سے باہر ہے۔

مجھے ایک خیال آیا تھا۔ یا سمین نے چہرے کو ذرا شگفتہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

کیسا خیال؟ ظہیر نے سوال کیا۔

کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے حلیمہ کا خیال آیا تھا۔ بے چاری کی شادی کو ایک

سال بھی نہ ہوا تھا۔ کہ اس کا شوہر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ظہیر نے کہا۔ میں ایسی موت سے بہت گھبراتا ہوں۔ بے چارے نے بیماری کی حالت میں بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی۔ ایک مجاہد کی موت کتنی اچھی موت ہے لیکن افسوس وہ اس سعادت سے محروم رہا۔ اس بیچارے کا اپنا قصور بھی تو نہ تھا۔ وہ بچپن سے مختلف جسمانی بیماریوں کا شکار رہا۔ جب اس کی موت سے چند دن پہلے مزاج پُرسی کے لیے گیا تو اس کی عجیب حالت تھی، اس نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

تم بہت خوش قسمت ہو۔ تمہارے بازو لوہے کی طرح مضبوط ہیں۔ تم گھوڑے پر چڑھ کر میدان جنگ میں دشمنوں کے تیروں اور نیزوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہو گے لیکن میں یہاں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ دنیا میں میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ میں بچپن میں مجاہد بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اب جوانی کا وقت آیا ہے تو میرے لیے بستر سے اٹھ کر چند قدم چلنا بھی دُشوار ہے۔

جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ میں نے اسے بہت تسلی دی لیکن وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہ جہاد پر جانے کی حسرت اپنے ساتھ ہی لے گیا لیکن اس کے پہلو میں ایک مجاہد کا دل تھا۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا لیکن ایسی موت اسے پسند نہ تھی۔

ظہیر نے بات ختم کی اور دونوں ایک گہری سوچ میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور موذن دنیا والوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے نماز میں شریک ہونے کا اُحدائی حکم سنا رہا تھا۔ یہ دونوں اس حکم کو بجالا

نے کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ظہیر نے دروازہ کھولا تو سامنے سعید سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈھکا ہوا گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ سعید گھوڑے سے اتر ااور ظہرے نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

سعید اور ظہیر بچپن کے دوست تھے۔ ان کی دوستی سگے بھائیوں کی محبت سے بھی زیادہ بے لوث تھی۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تعلیم پائی تھی۔ ایک ہی جگہ سپہ گری سیکھے تھے اور کئی میدانوں میں دوش بدوش لڑ کر اپنے بازوؤں کی طاقت اور تلواریں کی تیزی کے جوہر دکھا چکے تھے۔ ظہیر نے سعید کے اس طرح اچانک آنے کی وجہ پوچھی۔

مجھے والی، قیرون نے آپ کی طرف بھیجا ہے!

خیر تو ہے؟

نہیں۔ سعید نے جواب دیا۔ افریقہ میں بغاوت نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ اہل روم جاہل بربریوں کو اُکسا کر ہمارے مقابلے میں کھڑا کر رہے ہیں۔ اس آگ کو فرد کرنے کے لئے تازہ دم فوجوں کی ضرورت ہے۔ گورنر نے دربارِ خلافت سے چلا چلا کر مدد مانگی ہے لیکن وہاں ہماری آواز کوئی نہیں سنتا۔ نصرانی ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ان حالات پر قابو نہ پایا گیا تو ہم اس وسیع خطہء زمین کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھیں گے۔ گورنر نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ کے نام یہ خط دیا ہے۔

ظہیر نے خط کھول کر پڑھا، خط کا مضمون یہ تھا:

”سعید تمہیں افریقہ کے حالات بتا دے گا۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت

سے تمہارا فرض ہے کہ جس قدر سپاہی فراہم کر سکوان کو لے کر فوراً پہنچ جاؤ۔ میں نے ایک خط دربارِ خلافت میں بھی بھیجا ہے لیکن موجودہ حالات میں جب کہ اہل عرب طرح طرح کی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہیں، مجھے وہاں سے کسی مدد کی امید نہیں۔ تم اپنے طرف سے کوشش کرو!“

ظہیر نے ایک نوکر کو بلا کر سعید کا گھوڑا اس کے حوالے کیا اور اسے اپنے ساتھ مکان کے ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کی آنکھوں سے شبِ عروسی کا خمار اتر چکا تھا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر دیکھا، یا سمین بارگاہِ الہی میں سر بسجود تھی۔ دل کو گونہ مسرت ہوئی۔ واپس سعید کے پاس آ کر کھرا ہو گیا اور کہنے لگا:

سعید میری شادی ہو چکی ہے!

مبارک ہو۔ کب؟

کل۔

مبارک ہو! سعید مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اچانک پڑمردگی میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ دیر نہ دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا اور اس کی نگاہیں سوال کر رہی تھیں کہ شادی کی خوشی نے تمہیں جذبہ جہاد سے تو عاری نہیں کر دیا؟ ظہیر کی آنکھیں اس سوال کا جواب نفی میں دے رہی تھیں۔

دنیا میں کم و بیش ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اسے کسی بلندی تک پہنچنے یا بڑا کام کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن ہم اکثر نفع نقصان کی سوچ میں ایسے موقع کو کھودیتے ہیں۔

سعید نے پوچھا۔ آپ نے خط کے متعلق کیا سوچا؟

ظہیر نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سعید کے کندھوں پر رکھ دیا اور کہا:

اس میں سوچنے کی کیا بات ہے چلو!

”چلو“ بظاہر ایک سادہ سا لفظ تھا۔ لیکن ظہیر کے منہ سے سعید کو یہ لفظ سن کر جو خوشی ہوئی۔ اس کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ وہ بے اختیار اپنے دوست سے لپٹ گیا۔ ظہیر نے اور کوئی بات نہ کی۔ سعید کو اپنے ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلا اور مسجد کی طرف ہولیا۔

صبح کی نماز ختم ہوئی اور ظہیر تقریر کے لیے اٹھا۔ ایک مجاہد کو اپنی زبان میں اثر پیدا کرنے کے لیے اچھے اچھے الفاظ اور لمبی لمبی تاویلوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے سیدھے سادے مگر جذبات سے بھرے ہوئے الفاظ لوگوں کے دلوں میں اتر گئے۔ اس نے تقریر کے دوران میں آواز بلند کرتے ہوئے کہا:

مسلمانو! ہماری خود غرضیاں اور خانہ جنگیاں ہمیں کہیں کا نہ چھوڑیں گی۔ آج وہ وقت آگیا ہے کہ اہل روم جن کی سلطنت کو ہم کئی بار پاؤں تلے روند چکے ہیں۔ ایک بار پھر ہمارے مقابلے کی جرات کر رہے ہیں۔ وہ لوگ یرموک اور اجنادین کی شکستیں بھول چکے ہیں۔ آؤ انہیں ایک بار پھر بتائیں کہ مسلمان اسلام کی عظمت کی حفاظت کے لیے اب بھی اپنے خون کو اتنا ہی ارزاں سمجھتا ہے جتنا کہ پہلے سمجھتا تھا۔ انہوں نے طرح طرح کی سازشیں کر کے افریقہ کے لوگوں پر عرصہء حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم خانہ جنگیوں کی وجہ سے کمزور ہو چکے ہیں۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اس دنیا میں جب تک ایک بھی مسلمان زندہ ہے، ان لوگوں کو ہم

سے ڈر کر رہنا چاہیے۔

مسلمانو! آؤ ایک بار پھر انہیں یہ بتا دیں کہ ہمارے سینوں میں وہی تڑپ ہے، ہمارے بازوؤں میں وہی طاقت اور ہماری تلواروں میں وہی کاٹ ہے جو کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھی۔

ظہیر کی تقریر کے بعد اڑھائی سو نو جوان اُس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۳)

یاسمین اپنی زندگی کی تمام خواہشوں کے مرکز کو اپنی آنکھوں سے میدان جنگ کی طرف رخصت ہوتے دیکھ رہی تھی۔ دل کا بخار آنکھوں کے راستے آنسو بن کر بہنے کی لیے جدوجہد کر رہا تھا لیکن یاسمین کے نسوانی غرور نے شوہر کے سامنے اپنے آپ کو بڑا دل ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی۔ آنکھوں کے آنسو آنکھوں میں ہی دبے رہے۔

ظہیر نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ حزن و ملال کی تصویر بنی سامنے کھڑی تھی۔ دل نے سفارش کی کہ ایک لمحہ اور ٹھہر جاؤ چند باتیں کرو۔ لیکن اسی دل کی دوسری آواز تھی کی ایک اور امتحان سے بچو!

اچھا یاسمین! خدا حافظ۔ کہہ کر ظہیر لمبے لمبے قدم اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ ایک ایسا خیال جسے اس نے ابھی تک اپنے قریب نہ بھٹکنے دیا۔ برق کی سی تیز رفتاری کیساتھ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا۔ دل کی لطیف حصے نے اپنی کمزور آواز فقط اتنا کہا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو لیکن ایک لمحے

کے اندر اندر اس خیال نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ وہ رکا اور مڑ کر یاسمین کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آگے بڑھی۔ ظہیر نے آنکھیں بند کر کے بانہیں پھیلا دیں اور وہ روتی روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

یاسمین!

آقا!

وہ آنسو جنہیں یاسمین اپنے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی بے اختیار بہہ نکلے۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ لیکن دلوں کی یہ دھڑکن اس وقت بہت مدہم تھی اور بدستور کم ہو رہی تھی۔ کائنات اسی پر کیف نغمے سے لبریز تھی لیکن اس نغمے کی تانیں پہلے کی نسبت گہری تھیں۔ مجاہد کے امتحان کا وقت تھا۔ احساس محبت اور احساس فرض کا مقابلہ۔۔۔ ظہیر کے سامنے یاسمین تھی۔ فقط یاسمین۔ حسن و لطافت کا ایک پیکر۔ رنگ و بو کی دُنیا۔ پھر اچانک اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

یاسمین یہ فرض ہے۔

آقا مجھے معلوم ہے۔ یاسمین نے جواب دیا۔

میرے آنے تک حنیفہ تمہارا خیال رکھے گی۔ تم گھبراتو نہ جاؤ گی؟

نہیں آپ تسلی رکھیں۔

یاسمین مجھے مسکرا کر دکھاؤ۔ بہادر عورتیں ایسے موقع پر آنسو نہیں بہایا کرتیں۔ تم

ایک مجاہد کی بیوی ہو!

شوہر کے حکم کی تعمیل میں یاسمین مسکرا دی لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ ہی آنسوؤں کے دو موئے موئے قطرے اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

آقا مجھے معاف کرنا۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ کاش میں نے بھی ایک عرب ماں کی گود سے پرورش پائی ہوتی۔ یہ فقرہ ختم کرتے ہوئے انتہائی کرب کی حالت میں اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ابا زو ایک بار پھر ظہیر کی طرف پھیلا دیے لیکن آنکھیں کھولنے پر معلوم ہوا کہ محبوب شوہر جا چکا ہے۔

(۴)

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ یاسمین نے ایک ایرانی ماں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے اس کے وجود میں نسوانیت کا لطیف اور نازک حصہ عرب عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ظہیر کے رخصت ہوتے ہی اس کی بے قراری کی حد نہ رہی۔ دُنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔ حنیفہ اس کی پرانی خادمہ ہر ممکن کوشش سے اس کا دل بہلاتی۔ چند مہینوں کے بعد یاسمین کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے پہلو ایک نیا وجود پرورش پا رہا ہے۔ اس دوران میں شوہر کی طرف سے چند خطوط بھی ملے۔

حنیفہ نے اپنی طرف سے ظہیر کو لکھ بھیجا کہ تمہارے گھر میں ایک کمسن مہمان تشریف لانے والا ہے۔ واپس آنے پر گھر کی رونق میں اضافہ محسوس کرو گے۔ ہاں تمہاری بیوی سخت غمگین ہے۔ اگر رخصت مل جائے تو چند دن کے لیے آکر تسلی دے جاؤ!

آٹھ ماہ بعد ظہیر نے لکھا کہ وہ دو مہینوں تک گھر آجائے گا۔ اس خط کے بعد یاسمین کو انتظار کی گھڑیاں پہلے کی نسبت دشوار نظر آنے لگیں۔ اس کے لیے دن کا

چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی اور صحت بگڑنے لگی۔

ظہیر کے انتظار کے ساتھ ننھے مہمان کا انتظار بھی بڑھنے لگ۔ بالآخر ایک انتظار کی مدت ختم ہوئی اور ظہیر کے گھر کی خاموش فضا میں ایک بچے کے بلکنے نے کچھ رونق پیدا کر دی۔ یہ بچہ عذرا تھی۔

عذرا کی پیدائش کے بعد جب یاسمین نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو اس کا پہلا سوال یہ تھا۔ وہ نہیں آئے؟

وہ بھی آجائیں گے۔ حنیف نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر ہو گئی۔ خدا جانے کب آئیں گے۔

(۵)

عذرا کو پیدا ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ یاسمین کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ رات کو سوتے میں اکثر ظہیر ظہیر!! پکارتی اُتھ بیٹھتی اور بعض اوقات خواب کی حالت میں چلنے لگتی اور دیواروں سے ٹکرا کر گر پڑتی۔

حنیفہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اسے تسلی دیتی۔ اس کے سوا وہ کربھی کیاستی تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت یاسمین اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ حنیفہ اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی عذرا کو پیار کر رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

کوئی بلا رہا ہے۔ یاسمین نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔

حنیفہ عذرا کو یاسمین کے پاس لٹا کر اٹھی اور باہر جا کر دروازہ کھولا سامنے سعید کھڑا تھا۔

حنیفہ نے اضطراب اور پریشانی کی حالت میں کہا سعید تم آگئے ظہیر کہاں ہے وہ نہیں آیا؟ یا سمین کا کمرہ اگرچہ باہر کے دروازے سے کافی دُور تھا لیکن حنیفہ کے الفاظ یا سمین کے کانوں تک پہنچ چکے تھے۔ سعید کا نام سنتے ہی اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا اور ایک لمحے کے اندر اندر ہزاروں توہمات پیدا ہو گئے۔ وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو ہاتھوں سے دبائے بستر سے اُٹھی۔ کانپتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور حنیفہ سے دو تین قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ حنیفہ دروازے میں کھڑی ابھی تک سعید کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس لیے یا سمین کی آمد سے بے خبر تھی اور سعید چونکہ دروازہ سے باہر کھڑا تھا۔ اس لیے وہ یا سمین کو نہ دیکھ سکا۔

حنیفہ نے پھر اپنا سوال دہرایا لیکن سعید خاموش رہا۔

سعید! حنیفہ نے کہا جوا بکیوں نہیں دیتے۔ کیا ہو۔۔۔۔۔؟

سعید نے گردن اٹھا کر حنیفہ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان اس کے قابو میں نہ تھی۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے اور اس کا حسین چہرہ غیر معمولی حزن و ملال کا اظہار کر رہا تھا۔

سعید۔۔۔۔۔ کہو! حنیفہ نے پھر سوال کیا۔

وہ شہید ہو چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں زندہ واپس آیا ہوں۔

سعید نے کہا اور چھلکتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے گر پڑے۔

سعید نے اپنا فقرہ ابھی پورا ہی کیا تھا کہ حنیفہ کو پیچھے سے ایک چیخ سنائی دی اور کسی چیز کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ حنیفہ گھبرا کر پیچھے مڑی۔ سعید

بھی حیران ہو کر مکان کے صحن میں آگیا۔ یاسمین منہ کے بل پڑی تھی۔

سعید نے جلدی سے اسے اٹھایا اور کمرے کے اندر لا کر اس کے بستر پر لٹا دیا اور ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ جب مایوسی ہوئی تو طبیب کو بلانے کے لیے بھاگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب طبیب کو لے کر واپس آیا تو دیکھا کہ گھر میں محلے کی بہت سی عورتیں جمع ہیں کسی نے طبیب کو دیکھ کر کہا اب آپ کی ضرورت نہیں وہ جا چکی ہے۔

شام کے قریب شہر کے عامل نے یاسمین کا جنازہ پڑھایا۔ ظہیر کی شہادت کا واقعہ بھی مشہور ہو گیا تھا اس لیے اُس کے لیے بھی دُعاۓ مغفرت کی گئی۔ اس کے بعد ظہیر اور یاسمین کی کم سن یادگار عذرا کے حق میں درازی عمر کی دُعا مانگی گئی۔

(۶)

سعید نے اسی دن عذرا کو ایک دایہ کے سپرد کیا اور حنیفہ سے کہا کہ اگر تم ظہیر کے مکان میں رہنا چاہو تو میں تمہارے اخراجات برداشت کروں گا اور اگر میرے گھر رہنا پسند کرو تو بھی میں تمہاری خدمت کروں گا۔ لیکن حنیفہ نے کہا:

میں حلب میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ وہاں میرا ایک بھائی رہتا ہے۔ اگر میرا وہاں زیادہ دیر دل نہ لگا تو میں آپ کے پاس واپس آ جاؤں گی۔۔

سعید نے حنیفہ کے سفر کا انتظام کیا اور پانچ سو دینار دے کر رخصت کیا۔ دو سال کے بعد سعید عذرا کو اپنے گھر لے آیا اور خود اس کی پرورش کرنے لگا۔ جب اسے فارس کی طرف خارجیوں کے خلاف مہم پر جانا پڑا تو وہ عذرا کو صابرہ کے پاس چھوڑ گیا۔

بچپن

بستی کے نخلستانوں میں سے ایک بدی گزرتی تھی۔ بستی والوں نے مویشیوں کے لیے اس ندی کے کنارے ایک تالاب کھود رکھا تھا جو ندی کے پانی سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ تالاب کے ارد گرد کھجوروں کے درخت ایک دلفریب منظر پیش کرتے تھے۔ بستی کے بچے اکثر اوقات اس جگہ آ کر کھیلا کرتے تھے۔

ایک دن عبداللہ، نعیم اور عذرا بستی کے دوسرے بچوں کے ساتھ اس جگہ کھیل رہے تھے۔ عبداللہ نے اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ تالاب میں نہانا شروع کیا۔ نعیم اور عذرا تالاب کے کنارے کھڑے بڑے لڑکوں کو پانی میں تیرتے، اچھلتے اور کودتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ نعیم کو کسی بات میں بھی اپنے بھائی سے پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ ابھی اس نے تیرنا نہیں سیکھا تھا لیکن عبداللہ کو تیرتے ہوئے دیکھ کر ضبط نہ کر سکا۔ اس نے عذرا کی طرف دیکھا اور کہا۔ آؤ عذرا، ہم بھی نہائیں!۔

عذرا نے جواب دیا۔ امی جان خفا ہوں گی۔

عبداللہ سے کیوں خفا نہیں ہوں گی۔ ہم سے کیوں ہوں گی۔

وہ بڑا ہے۔ اسے تیرنا آتا ہے۔ اس لیے امی جان خفا نہیں ہوتیں۔

ہم گہرے پانی میں نہیں جائیں گے۔ چلو!

اُوں ہوں۔ عذرا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

تم ڈرتی ہو؟

نہیں تو۔

چلو پھر!

جس طرح نعیم ہر بات میں عبد اللہ کی تقلید کرنے بلکہ اس سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح عذرا بھی نعیم کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا گوارا نہ کرتی۔ نعیم نے ہاتھ بڑھایا اور عذرا اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں کود گئی۔ کنارے پر پانی زیادہ گہرا نہ تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ گہرے پانی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عبد اللہ اور دوسرے بچے مقابل کے کنارے کھجور کے ایک خم دار درخت پر چڑھ کر باری باری پانی ان کی گردنوں کے برابر آیا ہوا تھا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ بدستور پکڑا ہوا تھا۔ عبد اللہ نے گھبرا کر چلانا شروع کیا لیکن اس کی آواز پہنچنے سے پہلے عذرا اور نعیم گہرے پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ عبد اللہ تیزی سے تیرتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے نعیم کا پاؤں زمین پر لگ چکا تھا لیکن عذرا ڈبکیاں کھا رہی تھی۔ عبد اللہ نعیم کو محفوظ دیکھ کر عذرا کی طرف بڑھا۔

عذرا ابھی تک ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ وہ عبد اللہ کے قریب آتے ہی اس کے گلے میں بازو ڈال کر لپٹ گئی۔ عبد اللہ اس کا بوجھ سہار کر تیرنے کی طاقت نہ تھی۔ عذرا اس کے ساتھ بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے بازو پوری طرح حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دو تین بار پانی میا □ ڈوب ڈوب کر ابھرا، اتنی دیر میں نعیم کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے باقی باقی لڑکوں کے ساتھ مل کر چیخ پکار شروع کر دی۔ ایک چرواہا اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے تالاب کی طرف آ رہا تھا، لڑکوں کی چے و پکار سن کر بھاگا اور تالاب کے کنارے پر سے یہ منظر دیکھتے ہی کپڑوں سمیت

پانی میں کود پڑا۔ اتنی دیر میں عذرا بے ہوش ہو کر عبد اللہ کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر چکی تھی۔ اور وہ ایک ہاتھ سے عذرا کے سر کے بال پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے تیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چرواہے نے تیزی کے ساتھ جھپٹ کر عذرا کو اوپر اٹھالیا۔ عبد اللہ عذرا سے نجات پا کر آہستہ آہستہ تیرتا ہوا کنارے کے طرف بڑھا۔ چرواہا عذرا کو لے کر پانی سے باہر نکلا اور تیزی سے صابرہ کے مکان کی طرف چل دیا۔

عبد اللہ کے تالاب سے نکلتے ہی نعیم جھٹ دوسرے کنارے پر گیا اور عبد اللہ کے کپڑے اٹھالایا۔ عبد اللہ نے کپڑے پہنتے ہوئے نعیم پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ نعیم پہلے ہی آبلہ بن رہا تھا۔ بھائی کے غضب کے تاب نہ لا سکیاں لینے لگا۔ عبد اللہ نے نعیم کو روتے ہوئے بہت کم دیکھا تھا۔ اس موقع پر نعیم کے آنسو اس کا دل موم کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس نے کہا بہت گدھے ہو تم گھر چلو!

نعیم نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ امی جان ماریں گی۔ میں نہیں جاؤں گا۔

نہیں ماریں گی۔ عبد اللہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

عبد اللہ کے تسلی آمیز الفاظ سنتے ہی نعیم کے آنسو خشک ہو گئے اور وہ بھائی کے پیچھے ہولیا۔ چرواہا عذرا کو اٹھائے ہوئے صابرہ کے گھر پہنچا تو صابرہ کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ پڑوس کی چند اور عورتیں بھی اکٹھی ہو گئیں۔ بہت کوشش کے بعد عذرا کو ہوش میں لایا گیا۔ صابرہ نے چرواہے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

یہ نعیم کی شرارت ہوگی۔ میں اسے عذرا کے ساتھ باہر بھیجتے ہوئے ہمیشہ ڈرا کرتی تھی، پرسوں ایک لڑکے کا سر پھوڑ دیا۔ اچھا آج وہ گھر آئے ہی!۔

چرواہے نے کہا اس میں نعیم کا کوئی قصور نہیں۔ وہ بے چارہ تو کنارے پر کھڑا چیخ پکار کر رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر بھاگتا ہوا تالاب پر پہنچا تو آپ کے بڑے لڑکے نے عذرا کو بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور وہ غوطے کھا رہی تھی۔

عبداللہ۔ صابرہ نے حیران ہو کر کہا۔ وہ تو ایسا نہیں!

چرواہے نے کہا۔ آج تو میں بھی اس کی حرکات دیکھ کر بہت حیران ہوا ہوں۔ اگر میں موقع پر نہ پہنچتا تو اس نے معصوم لڑکی کو ڈبو دیا تھا۔

اتنے میں عبداللہ گھر پہنچا۔ نعیم اسکے پیچھے پیچھے سر جھکائے آ رہا تھا۔ جب عبد اللہ صابرہ کے روبرو ہوا تو نعیم اس کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

صابرہ غضبناک ہو کر بولی: عبداللہ! جاؤ میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ۔ میرا خیال تھا کہ تم میں کچھ شعور ہے مگر آج تم نعیم سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئے۔ عذرا کو ڈبونے کے لیے ساتھ لے گئے تھے؟

عبداللہ جو سارا راستہ نعیم کو بچانے کی تجاویز سوچتا آیا تھا۔ اس غیر متوقع استقبال پر حیران ہوا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ قصور نعیم کے بجائے اس کے سر تھوپا جا رہا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ننھے بھائی کی نگاہیں التجا کر رہی تھیں کہ مجھے بچاؤ۔ عبد اللہ کو اس کے بچانے کی یہی صورت نظر آئی کہ وہ ناکردہ گناہ پانے سر لے لے، یہ سوچ کر وہ خاموش کھڑا رہا اور ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا۔

(۶)

رات کے وقت عذرا کو زکام کے ساتھ بخار کی شکایت ہو گئی۔ صابرہ عذرا کے

سرہانے بیٹھی تھی۔ نعیم بھی نہایت غمگین صورت بنائے پاس بیٹھا تھا۔ عبداللہ اندر داخل ہوا اور چپکے سے صابرہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ صابرہ اس کی آمد سے بے خبر عذرا کا سر دباتی رہی۔ نعیم نے ہاتھ سے عبداللہ کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور اپنا مکا دکھا کر اسے اشاروں میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ چلے جاؤ ورنہ خیر نہیں۔ عبداللہ نے اس کے اشاروں سے متاثر ہونے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔

نعیم کو اشارہ کرتے دیکھ کر صابرہ نے عبداللہ کی طرف نگاہ اٹھائی۔ عبداللہ ماں کے غضب آلود نظروں سے گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔ اب عذرا کیسی ہے؟

صابرہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی، اب ضبط نہ کر سکی۔ ٹھہرو میں تمہیں بتاتی ہوں! یہ کہہ کر اٹھی اور عبداللہ کو کان سے پکڑ کر باہر لے آئی۔ صحن کی ایک طرف اُصطبل تھا۔ صابرہ نے عبداللہ کو دروازے پر لے جا کر کہا۔ عذرا کو اس لیے دیکھنے گئے تھے کہ وہ ابھی تک مری کیوں نہیں۔ تم رات یہیں بسر کرو! عبداللہ کو یہ حکم دے کر صابرہ پھر عذرا کے سرہانے آ بیٹھی۔

جب نعیم کھانا کھانے بیٹھا تو اسے بھائی کا خیال آیا اور لقمہ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ اس نے صابرہ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

امی جان! بھائی کہاں ہے؟

وہ آج اُصطبل میں رہے گا۔

امی اسے کھانا دے آؤں؟

نہیں خبردار اس کے پاس گئے تو!

نعیم نے چند بار لقمہ اٹھایا مگر اس کا ہاتھ منہ تک پہنچ کر رُک گیا۔
کھاتے نہیں؟ صابرہ نے پوچھا۔

کھا رہا ہوں امی! نعیم نے ایک لقمہ جلدی سے منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔
صابرہ عشا کی نماز کے لیے وضو کرنے اٹھی اور جب وضو کر کے واپس آئی تو
نعیم کو اسی حالت میں بیٹھے دیکھ کر بولی۔

نعیم تم نے آج بہت دیر لگائی۔ ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟
نعیم نے جواب دیا۔ کھا چکا ہوں امی!

صابرہ نے برتن جن میں کھانا ابھی تک ویسے ہی تھا۔ اٹھا کر دوسرے کمرے
میں رکھ دیے اور نعیم کو سو جانے کے لیے کہا۔ نعیم اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب
صابرہ نماز کے لیے کھڑی ہو گئی تو وہ چپکے سے اٹھا اور دبے پاؤں دوسرے کمرے
سے کھانا اٹھا کر اصطبل کی طرف چل دیا۔ عبداللہ چرنی پر بیٹھا ایک گھوڑے کے منہ
پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ چاند کی روشنی دروازے کے راستے عبداللہ کے منہ پر پڑ رہی تھی۔
نعیم نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ امی جان نماز پڑھ رہی ہیں۔ جلدی سے
کھا لو!

عبداللہ نعیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ لے جاؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔
کیوں مجھ سے ناراض ہونا؟ اس نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔
نہیں نعیم، امی جان کا حکم ہے۔ تم جاؤ۔

میں نہیں جاؤں گا۔ میں بھی یہیں رہوں گا۔

جاؤ نعیم، تمہیں امی جان ماریں گی!

نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ نعیم نے عبداللہ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

نعیم کے اصرار پر عبداللہ خاموش ہو گیا۔

ادھر صابرہ نے نماز ختم کی۔ مامتا زیادہ ضبط کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ اُف! میں کتنی ظالم ہوں۔ اسے خیال آیا اور نماز ختم کرتے ہی اصطبل کی طرف چل دی۔ نعیم نے ماں کو آتے دیکھا تو چھپنے کی بجائے بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور چلایا:

امی بھائی کا کوئی قصور نہیں۔ میں عذرا کو گہرے پانی میں لے گیا تھا۔ بھائی تو اسے بچا رہا تھا۔ صابرہ کچھ دیر پریشانی کی حالت میں کھڑی رہی۔ بالآخر اس نے کہا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ عبداللہ ادھر آؤ۔ عبداللہ اٹھ کر آگے بڑھا۔ صابرہ نے پیار سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کا سر سینے سے لگایا۔

عبداللہ نے کہا۔ امی آپ نعیم کو معاف کر دیں۔

صابرہ نے نعیم کی طرف دیکھا اور کہا:

بیٹا تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کیوں نہ کیا؟

نعیم نے جواب دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ بھائی کو سزا دیں گی۔

اچھا تم کھانا اٹھا لو۔

نعیم نے کھانا اٹھالیا اور تینوں مکان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ عذرا سو رہی تھی۔ ان تینوں میں سے کسی نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ تمام ایک جگہ بیٹھ کر کھانے لگے۔

(۳)

ان بچوں کی تعلیم و تربیت صابرہ کی زندگی کی تمام دلچسپیوں کا مرکز تھی۔ اس تنہائی کے باوجود ایک عورت کو خاوند کی موت کے بعد محسوس ہوا کرتی ہے، صابرہ کا اُجڑا ہوا گھر اس کے لیے ایک پر رونق شہر سے کم نہ تھا۔

رات کے وقت جب وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوتی تو عبداللہ، عذرا اور نعیم اسکے قریب بیٹھ کر کہانی سنانے کا مطالبہ کرتے۔ صابرہ انہیں کفر و اسلام کی ابتدائی جنگوں کی واقعات سناتی اور رسول برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات بتاتی۔

ان بچوں کا بے فکری کا زمانہ گزرتا گیا۔ صابرہ کی تربیت کے باعث ان کے دلوں میں سا پہیانہ زندگی کے تمام خصائل روز بروز ترقی کر رہے تھے۔ عبداللہ عمر میں جس قدر بڑا تھا، عذرا اور نعیم کے مقابلے میں اتنا ہی سنجیدہ اور متین تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں قرآن پاک اور چند ابتدائی کتابیں ختم کر چکا تھا۔ نعیم ایک تو کم عمر ہونے کی بنا پر اور دوسرے کھیل کود میں زیادہ حصہ لینے کی وجہ سے پڑھائی میں عبداللہ سے پیچھے تھا۔ اسکی شوخی اور چلبلا پن تمام بستی میں مشہور تھا۔ وہ اُونچے سے اُونچے درخت پر چڑھ سکتا تھا اور تند سے تند گھوڑے پر سواری کرنے کا عادی تھا۔ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرتے ہوئے اس نے کئی بار گر کر چوٹیں کھائیں لیکن وہ ہر بار ہنستا اور خطرے کے مقابلے کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ جرات لے کر اُٹھتا۔ تیر اندازی

میں بھی اس نے اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ گاؤں میں بڑی عمر کے لڑکے بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔

ایک دن عبداللہ صابرہ کے سامنے بیٹھا سبق سن رہا تھا اور نعیم تیرکمان ہاتھ میں لیے مکان کی چھت پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ صابرہ نے آواز دی۔ نعیم ادھر آؤ۔ آج تم نے سبق یاد نہیں کیا؟

آتا ہوں امی۔

صابرہ پھر عبد اللہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اچانک ایک کوا اڑتا ہوا آیا۔ نعیم نے جلدی سے نشانہ کیا۔ کوا قلابازیاں کھاتا ہوا صابرہ کی قریب آگرا۔ صابرہ نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ نعیم کمان ہاتھ میں لیے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ صابرہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ بہت نالائق ہو تم!

ای آج بھائی نے کہا تھا کہ تم اُڑتے ہوئے پرندے کو نشانہ نہیں بنا سکتے!

اچھا بہت بہادر ہوں تم۔ آؤ اب سبق سناؤ!

چودہ سال کی عمر میں عبداللہ علوم دینی اور فنون سپہ گری کی تکمیل کے لیے بصرہ کے ایک مکتب میں داخل ہونے کے لیے رخصت ہوا اور عذرا کی دنیا کی آدھی خوشی اور ماں کے محبت بھرے دل کا ایک ٹکڑا ساتھ لیتا گیا۔ ان تینوں بچوں کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ضروری نہیں کہ عذرا کو نعیم اور عبداللہ سے بچہ محبت تھی۔ لیکن یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو زیادہ چاہتی تھی۔ اس کے معصوم دل پر کون زیادہ گہرے نقوش پیدا کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کس کو بار بار دیکھنے کے لیے بیقرار رہتیں اور اس کے کانوں میں کس کی آواز ایک نغمہ بن کر گونجتی

تھی۔

بظاہر خود عذرا بھی اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے نعیم اور عبداللہ ایک ہی وجود کے مختلف نام تھے اور نعیم کے بغیر عبداللہ اور عبداللہ کے بغیر نعیم کا تصور اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے اپنے دل میں کبھی ان دونوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان دونوں کی موجودگی میں بھلا اسے کسی گہری سوچ میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھ۔ جب ان دونوں میں سے کوئی ہنستا ہوا نظر آتا تو وہ اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتی اور جب کسی کو سنجیدہ دیکھتی تو فوراً سنجیدہ ہو جاتی۔

عبداللہ کے بصرہ چلے جانے کے بعد اسے ان باتوں کے متعلق سوچنے کا موقع ملا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ رصہ بعد نعیم بھی وہاں چلا جائے گا۔ لیکن نعیم سے جدائی کا تصور بھی اسے عبداللہ کی جدائی سے زیادہ صبر آزما محسوس ہوتا تھا۔ عبداللہ کا عمر میں بڑا ہونا۔ اس کی متانت و سنجیدگی عذرا کے دل میں اس کی محبت کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت اور بلندی کا احساس پیدا کر چکی تھی۔ وہ محبت سے زیادہ اس کا احترام کرتی تھی۔ اسے نعیم کی طرح بھائی جان کہہ کر پکارتی اور اپنے ارفع اور اعلیٰ سمجھتے ہوئے اس کی ساتھ میل جول اور باتوں میں قدرے تکلف سے کام لیتی۔ نعیم کی عظمت بھی اس کے دل میں کم نہ تھی لیکن اس کے ساتھ گہرے لگاؤ نے اسے تکلفات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کی دنیا میں عبداللہ ایک سورج کی حیثیت رکھتا تھا جس کی طرف ہم اس کی خوشنمائی کے باوجود آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے اور اس کے قریب جانے کا خیال سے گھبراتے ہیں لیکن نعیم کی ہر بات اسے اپنے منہ سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی۔

عبداللہ کے چلے جانے کے بعد نعیم کی عادات میں ایک عجیب تغیر رونما ہوا۔

شاید اس خیال سے کہ صابرہ عبداللہ کی جدائی بہت زیادہ محسوس نہ کرے یا اس لیے کہ وہ بھی بصرہ کے مدرسے میں داخل ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ بہر حال وہ بچپن کی تمام عادات چھوڑ کر پڑھائی میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے ایک دن صابرہ سے سوال کیا۔ امی آپ مجھے بصرہ کب بھیجیں گی؟

ماں نے جواب دیا بیٹا جب تک تم اپنی ابتدائی تعلیم ختم نہیں کر لیتے۔ میں تمہیں وہاں بھیج کر لوگوں سے یہ کہلوانا پسند نہیں کرتی کی عبداللہ کا بھائی بے علم ہے۔ گھوڑے پر چڑھنے اور تیر چلانے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔

ماں کے الفاظ نعیم کے حساس دل میں نشتر کی طرح چبھے۔ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ امی! مجھے کوئی جاہل کہنے کی جرات نہ کرے گا۔ میں تمام کتابیں اسی سال ختم کر لوں گا۔

صابرہ نے پیار سے نعیم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

بیٹا تمہارے لیے کوئی بات مشکل نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ تم کچھ کرتے نہیں!

ضرور کروں گا۔ امی اب آپ کو مجھ سے یہ شکایت نہ رہے گی۔

(۴)

ماہ رمضان کی چھٹیوں میں عبداللہ گھر آیا۔ وہ سپاہیانہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ بستی کے لڑکے اسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ نعیم اسے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ عذرا اسے دور ہی دور سے دیکھ کر شرماتی اور صابرہ بار بار اس کی پیشانی چومتی۔ نعیم نے عبداللہ سے مدرسے کے متعلق بہت سے سوالات کیے۔ عبداللہ نے

اسے بتایا کہ وہاں پڑھائی کے علاوہ زیادہ وقت فنونِ جنگ کے تحصیل میں صرف ہوتا ہے۔ نیزہ بازی، تیغ زنی اور تیر اندازی سکھائی جاتی ہے۔ تیر اندازی کے متعلق سن کر نعیم کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

بھائی جان مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اس نے ماتحتی ہو کر کہا!

تم ابھی چھوٹے ہو۔ وہاں تمام لڑکے تم سے بہت بڑے ہیں۔ تمہیں کچھ مدت صبر کرنا پڑے گا۔

نعیم نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سوال کیا۔ بھائی جان! مدر سے میں آپ سب لڑکوں پر سبقت لے جاتے ہوں گے؟
عبداللہ نے جواب دیا۔

نہیں بصرہ کا ایک لڑکا میرا مدِ مقابل ہے۔ اس کا نام محمد بن قاسم ہے۔ وہ تیر اندازی اور نیزہ بازی میں تمام مدر سے کے لڑکوں سے اچھا ہے۔ تیغ زنی میں ہم دونوں برابر ہیں۔ میں اسے کبھی کبھی تمہارا ذکر کیا کرتا ہوں۔ وہ تمہاری باتیں سن کر بہت ہنسا کرتا ہے۔

ہنسا کرتا ہے؟ نعیم نے تیوڑی چڑھا کر کہا۔ میں اسے جا کر بتاؤں گا کہ میں ایسا نہیں ہوں کہ لوگ مجھ پر ہنسا کریں۔

عبداللہ نے نعیم کو برگشتہ دیکھ کر گلے لگالیا اور اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔ رات کے وقت عبداللہ لباس تبدیل کر کے سو گیا۔ نعیم اس کے قریب بستر پر پڑا کافی دیر تک جاگتا رہا۔ جب نیند آئی تو اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ بصرہ کے

مدرسے کے طلباء کے ساتھ تیر اندازی اور نیزہ بازی میں مصروف ہے۔ وہ علی الصباح سب سے پہلے اٹھا جلدی جلدی عبداللہ کی وردی پہنی اور عذرا کو آجگیا۔

عذرا دیکھو! مجھے یہ لباس کیسا لگتا ہے؟

عذرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نعیم کو سر سے پاؤں تک دیکھا، مسکرائی اور بولی۔ تم اس لباس میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہو

عذرا میں بھی وہاں جاؤں گا اور وہاں سے یہ لباس پہن کر آؤں گا!

عذرا کے چہرے پر ادا سی چھا گئی۔ تم وہاں کب جاؤ گے؟ اس نے سوال کیا۔
عذرا میں امی جان سے بہت جلد اجازت لے لوں گا۔

مکتب

۳۵ھ سے ۵۵ھ تک کی اسلامی تاریخ چند ایسے خونیں حادثات سے پُر ہے جن کے متعلق گزشتہ صدیوں میں بہت آنسو بہائے جا چکے ہیں اور جن کی یاد میں مستقبل میں بھی اشکوں اور آہوں کے بغیر تازہ نہ کی جاسکے گی۔ وہ تلوار جو خدا کے نام پر بلند ہوتی تھی۔ اس زمانے میں خدا کا نام لینے والوں کے گلے کاٹتی رہی۔ یہ خطرہ روز بروز ترقی کر رہا تھا کہ مسلمان چند سال کے عرصے میں جس سرعت کے ساتھ اطراف عالم پر چھا گئے تھے، کہیں اتنی ہی تیزی کے ساتھ سمٹ کر جزیرہ نمائے عرب میں محبوس نہ ہو جائیں! اس زمانے میں کوفہ اور بصرہ طرح طرح کی سازشوں کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ مسلمان اپنی ابتدائی روایات کو بھول کر جذبہ جہاد سے منہ پھیر چکے تھے۔ ان کے پیش نظر ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے جدوجہد اور اپنی واجب اور نا واجب باتوں پر اڑ بیٹھنے کے سوا اور کوئی نظریہ نہ تھا۔ مسلمانوں کو پھر ایک مرکز پر لانے کے لیے ایک اپنی ہاتھ کی ضرورت تھی۔

صحرائے عرب میں ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور عرب و عجم میں بغاوتوں کی سلگتی ہوئی چنگاریاں اس آتش فشاں پہاڑ کے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں آ کر نابود ہو گئیں۔ یہ آتش فشاں پہاڑ حجاج بن یوسف تھا۔ بے حد شخت گیر، بے رحم اور سفاک لیکن قدرت صحرائے عرب کی اندرونی جنگوں کو ختم کر کے مسلمانوں کے شد گھوڑوں کا رخ مشرق و مغرب کی رزم گاہوں کی طرف پھیر دینے کا کام اسی سے لینا چاہتی تھی۔

حجاج بن یوسف کو مسلمانوں کا دوست بھی کہا جاسکتا ہے اور بدترین دشمن بھی۔

بہترین دوست اس لیے کہ اس نے ایک پُر امن فضا پیدا کر کے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کے لیے تین زبردست راستے صاف کیے۔ ایک راستہ وہ تھا جو مسلمانوں کی فوج کو فرغنہ اور کاشغر تک لے گیا۔ دوسرا راستہ وہ جو مسلمانوں کے سمندرِ اقبال کو مراکش، سپین اور فرانس کی حدود تک لے گیا۔ تیسرا راستہ وہ تھا جس نے محمد بن قاسم کی مٹھی بھر فوج کو سندھ تک پہنچا دیا۔

بدترین دشمن اس لیے کہ اس کی خون آشام تلوار جو شر پسندوں اور مفسدوں کی سرکوبی کے لیے بے نیام ہوئی تھی، بسا اوقات اپنی حدود سے گزر کر بے گناہوں کی گردن تک بھی جا پہنچتی تھی۔ اگر حجاج بن یوسف کا دامن مظلوموں کے خون سے داغدار نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تاریخ اسے اس زمانے کے ایک عظیم الشان انسان کی حیثیت سے نہ دیکھتی۔ وہ ایک ایسا بگولہ تھا جو کانٹے دار جھاڑیوں کے ساتھ گلشنِ اسلام کے کئی مہکتے ہوئے پھول اور سرسبز ٹہنیاں بھی اڑا کر لے گیا۔

بہر حال اس کے عہد کے ایک حصہ بے حد المناک اور دوسرا بے حد خوشگوار تھا۔ وہ اس آندھی کی طرح تھا جس کی تیزی بعض سرسبز درختوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالتی ہے لیکن جس کی آغوش میں چھپے ہوئے بادل برس کی ہزاروں سُکھی ہوئی کھیتوں کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں۔

۵۷ھ میں صحرائے عرب کی خانہ جنگیاں ختم ہو گئیں۔ مسلمان پھر ایک ہاتھ اور قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر اُٹھے۔ اس زمانے میں حجاج بن یوسف کے نام کے ساتھ زید بن عامر کے نام کا چرچا ہونے لگا۔ زید بن عامر کی عمر اسی سال تھی۔ جوانی کے عالم میں ہوان شاہسواروں کے ہم رکاب رہ چکا تھا جو ایران کے کسریٰ اور شام و فلسطین میں قیصر کی سلطنت کو پائمال کر چکے تھے۔ جب بڑھاپے کی

کمزوری نے تلوار اٹھانے سے انکار کر دیا تو اس نے ایران کے ایک صوبہ میں قاضی کا عہدہ قبول کر لیا۔ جب عرب میں شورش برپا ہوئی تو ابن عامر کوفہ پہنچا اور اپنی تبلیغ سے وہاں کے حالات سدھارنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی آواز صدالصحرا ثابت ہوئی۔

کوفہ کے لوگوں کی بے اعتنائی دیکھ کر ابن عامر بصرہ پہنچا لیکن وہاں کے حالات بھی کوفہ سے کچھ مختلف نہ تھے۔ فارغ البال اور شر پسند لوگوں نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی۔ نوجوانوں اور بوڑھوں سے مایوس ہو کر ابن عامر نے اپنی تمام امیدیں کم سن بچوں کے ساتھ وابستہ کر دیں اور اپنی تمام کوششیں ان کی تعلیم و تربیت کی طرف مبذول کر دیں۔ اس نے شہر کے باہر ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ جب بصرہ میں امن قائم ہوا تو وہاں کے چیدہ چیدہ لوگوں نے ابن عامر کی حوصلہ افزائی کی۔ مدرسہ میں طلباء کو دینی کتب پڑھانے کے علاوہ جنگی فنون کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ حجاج بن یوسف اس بے لوث خدمت سے متاثر ہوا اور مدرسے کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لے لیے۔ طلباء کو جنگ اور شاہسواری وغیرہ میں پوری مہارت دلانے کے لیے بہترین نسل کے گھوڑے اور نئے نئے اسلحہ جات مہیا کیے اور گھوڑوں کے لیے مکتب کے پاس ہی ایک شاندار اصطبل تیار کروایا۔

طلبا ہر شام مدرسہ کے قریب ایک وسیع میدان میں جمع ہو جاتے۔ وہاں انہیں عملی طور پر فوجی تعلیم دی جاتی۔ شہر کے لوگ شام کے وقت اس میدان کے ارد گرد جمع ہو کر طلباء کی تیغ زنی، نیزہ بازی اور شاہسواری کے نئے نئے کرتب دیکھا کرتے۔

سعید نے جب اس مدرسے کی شہرت سنی تو صابرہ کو خط لکھ کر مشورہ دیا کہ عبداللہ کو اس مدرسے میں بھیج دیا جائے۔ عبداللہ اس ماحول میں دن دو گنی رات

چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ وہ جہاں تعلیم میں اپنے بہت سے ساتھیوں کے لیے قابل رشک تھا وہاں فنونِ سپہ گری میں بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکا گیا۔

عبداللہ کو اس شہر میں آئے ابھی دو سال ہوئے تھے کہ بصرہ کے بچے اور بوڑھے اس کے نام سے واقف ہو گئے۔ ابن عامر کی نگاہوں سے بھی اس ہونہار شاگرد کے جوہر پوشیدہ نہ تھے۔

(۶)

ایک روز دوپہر کے وقت ایک نو عمر لڑکا گھوڑے پر سوار شہر میں داخل ہوا۔ اس نو وارد کے ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے میں گھوڑے کی باگ تھی۔ کمر کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی گلے میں حماکل اور پیٹھ پر ترکش بندھا ہوا تھا۔ کمان زین کے پچھلے حصے کے ساتھ بندھی ہوئی تھی، اس کی تلوار اس کے قد و قامت کے تناسب سے بہت بڑی تھی۔ کم سن سوار گھوڑے پر اکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہر راہگیر اسے گھور گھور کر دیکھتا اور مسکرا دیتا اور بعض ہنس بھی پڑتے۔ اس کے ہم عمر لڑکے اسے ایک دل لگی سمجھ کر اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور تھوڑی دیر میں اس کے آگے پیچھے ایک اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لڑکوں نے اس کے لیے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا راستہ روک لیا۔ ایک لڑکے نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بدو کا نعرہ بلند کیا اور تمام بدو بدو کہہ کر چلانے لگے، دوسرے نے ایک کنکر اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ اب تمام لڑکوں نے کنکر پھینکنے شروع کر دیے۔ ایک من چلے نے جو اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھ کر اس کا نیزہ چھیننا چاہا لیکن نو وارد نے نیزہ مضبوطی سے تھامے رکھا اور گھوڑے کی باگ کھینچ کر ایڑ لگا دی۔ گھوڑے کی شیخ پا ہونا تھا کہ تمام لڑکے ادھر ادھر ہٹ گئے۔ نو وارد نے ٹولی کے رہنما کی طرف نیزہ بڑھا کر گھوڑا اس کے پیچھے

لگا دیا۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑ ہوا۔ نووارد نے ہلکی رفتار سے اس کا تعاقب کیا۔
باقی لڑکے پیچھے پیچھے بھاگتے آرہے تھے۔ چند عمر رسیدہ لوگ بھی یہ دلچسپ منظر دیکھ
کر اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ آگے بھاگنے والے لڑکے کا پاؤں کس چیز سے
ٹکرایا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ نووارد نے گھوڑے کی باگ تھام لی اور پیچھے آنے
والوں کی طرف مڑ کر دیکھا اور وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

اس گروہ میں سے مالک بن یوسف ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آگے بڑھا۔ اس کا
قد پست اور بدن چھریا تھا۔ سر پر ایک بہت بڑا عمامہ تھا اور اوپر کے دانت کچھ اس
حد تک باہر نکلے ہوئے تھے کہ وہ مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر
نووارد سے سوال کیا:

تم کون ہو؟

مجاہد، کم سن لڑکے نے اکڑ کر جواب دیا۔

بہت اچھا نام ہے۔ تم بہت بہادر ہو۔

میرا نام نعیم ہے۔

تو تمہارا نام مجاہد نہیں؟

نہیں میرا نام نعیم ہے۔

تم کہاں جاؤ گے؟ مالک نے سوال کیا۔

ابن عامر کے مکتب میں، وہاں میرا بھائی پڑھتا ہے۔

وہ لوگ اس وقت اکھاڑے میں ہوں گے۔ چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔

نعیم مالک کے ساتھ چل دیا۔ چند لڑکے تھوڑی دُور ساتھ دے کر مُڑ گئے اور کچھ نعیم کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

نعیم نے اپنے رہنما سے سوال کیا۔ اکھاڑے میں تیر اندازی بھی ہوتی ہے؟

ہاں تم تیر چلانا جانتے ہو؟

ہاں میں اُڑتے ہوئے پرندو کو گرا لیتا ہوں۔

مالک نے پیچھے مُڑ کر نعیم کی طرف دیکھا۔ نعیم کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اکھاڑے میں بہت سے لوگ الگ الگ ٹولیوں میں کھڑے طلبا کی تیر اندازی، تیغ زنی اور نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ مالک نے وہاں پہنچ کر نعیم سے کہا۔

تمہارا بھائی یہیں ہوگا۔ تم کھیل ختم ہونے سے پہلے اس سے نہیں مل سکو گے۔
فی الحال یہ تماشا دیکھو!

نعیم نے کہا میں تیر اندازی دیکھوں گا۔

مالک اسے تیر اندازوں کے اکھاڑے کی طرف لے گیا اور دونوں تماشا سائیوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔

اکھاڑے میں ایک کونے پر لکڑی کا ایک تختہ نصب تھا جس کے درمیان ایک سیاہ نشان تھا۔ لڑکے باری باری اس پر نشانہ لگاتے۔ نعیم دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ اکثر تیر تختے پر جا کر لگتے لیکن سیاہ نشان پر ایک طالب علم کے سوا کسی کا تیر نہ لگا۔

نعیم نے مالک سے پوچھا۔ وہ کون ہے۔ اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔

مالک نے جواب دیا۔ وہ حجاج بن یوسف کا بھتیجا محمد بن قاسم ہے۔

محمد بن قاسم!!

ہاں، تم اسے جانتے ہو؟

ہاں، وہ میرے بھائی کا دوست ہے۔ بھائی جان اس کے نشانے کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن یہ نشانہ کوئی مشکل تو نہیں۔

مشکل کیا ہے؟ یہ تو شاید میں بھی لگا سکوں۔ ذرا مجھے اپنی کمان تو دینا۔ حجاج کا بھتیجا کیا خیال کرے گا کہ اب دنیا میں کوئی تیر انداز نہیں رہا۔

یہ کہہ کر اس نے نعیم کے گھوڑے کی زین سے کمان کھولی۔ نعیم نے اس ترکش سے تیر نکال کر دیا۔ مالک نے آگے بڑھ کر شست باندھی۔ لوگ اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ مالک نے کانپتے ہاتھوں سے تیر چھوڑا جو ہدف کے طرف جانے کے بجائے چند قدم کے فاصلے پر زمین میں دھنس گیا۔ تماشاویوں نے ایک پر زور قہقہہ لگایا۔ مالک کھیانا ہو کر واپس ہوا اور کمان نعیم کو دے دی۔ محمد بن قاسم ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ تیر زمین سے کھینچ کر نکالا اور آگے بڑھ کر مالک کو پیش کرتے ہوئے کہا:

آپ ایک بار اور کوشش کریں!

مالک کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ اس نے بدحواسی میں محمد بن قاسم سے تیر لے کر نعیم کی طرف بڑھا دیا۔ مالک کی اس حرکت سے لوگوں کی توجہ نعیم کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ یکے بعد دیگرے کھسک کھسک کر نعیم کی طرف آنے لگے۔ محمد بن

قاسم بدستور ہنستا ہوا آگے بڑھا اور نعیم کو مخاطب کر کے بولا۔ آپ بھی شوق فرمائیے۔ لوگ پھر ہنسنے لگے۔

نعیم اس کی طنز اور لوگوں کی ہنسی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جھٹ نیزہ نیچے گاڑ دیا اور کمان میں تیر چڑھا کر چھوڑ دیا۔ تیر ہدف کے سیاہ نشان کے عین درمیان میں جا کر پیوست ہو گیا۔ مجمع پر ایک لمحہ کے لیے سکوت طاری ہو گیا اور پھر ایک شور بلند ہوا۔

نعیم نے ترکش سے دوسرا تیر نکالا۔ تمام لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کا دوسرا تیر بھی عین نشانے پر لگا۔ چاروں طرف سے مرحبا کی صدا بلند ہوئی۔ نعیم نے مجمع پر ایک نگاہ دوڑائی اور دیکھا کہ تمام لوگوں کی نگاہیں اس پر عقیدت کے پھول برسا رہی ہیں۔ محمد بن قاسم مسکراتو ہوا آگے بڑھا اور نعیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

آپ کا نام کیا ہے؟

مجھے نعیم کہتے ہیں۔

نعیم، نعیم بن؟

نعیم بن عبد الرحمن۔

تم عبد اللہ کے بھائی ہو؟

ہاں!

یہاں کب آئے؟

ابھی۔

عبداللہ سے نہیں ملے؟

ابھی نہیں۔

تمہارا بھائی نیزہ بزی یا شمشیر زنی کی مشق کر رہا ہوگا۔ تم تلوار چلانا جانتے ہو؟
میں بستی میں سیکھا کرتا تھا۔

تمہاری تیر اندازی دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ تم تلوار چلانے میں بھی کافی
مہارت حاصل کر چکے ہو گئے۔ آج ایک لڑکے کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہوگا!

مقابلے کا لفظ سن کر نعیم کی رگوں میں خون کا دور تیز ہو گیا۔ اس نے پوچھا کتنا
بڑا ہے وہ؟

تم سے کوئی زیادہ بڑا نہیں۔ اگر پھرتی سے کام لو گے تو اس سے جیت جانا
تمہارے لیے کوئی بات نہیں۔ ہاں تمہاری تلوار ذرا بھائی ہے۔ زرہ بھی بہت ڈھیلی
ہے۔ میں ابھی اس کا انتظام کیے دیتا ہوں۔ تم گھوڑے سے اترو!

محمد بن قاسم نے ایک شخص کو اپنی زرہ، خود اور تلوار لانے کے لیے کہا۔

(۳)

تھوڑی دیر میں نعیم ایک نئی زرہ پہنے اور ہاتھ میں ایک ہلکی سی تلوار لیے
تماشائیوں کی صف میں کھڑا بن عامر کے شاگردوں کو تیغ زنی کی مشق کرتے دیکھ رہا

تھا۔ اس کے سر پر یونانی وضع کے خود نے اس کا چہرہ تھوڑی تک چھپا رکھا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کے سوا جو اس کی تیر اندازی سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ چلے آئے تھے، کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کوئی اجنبی ہے۔

ابن عامر تماشاخیوں کے گروہ سے الگ میدان میں کھڑا اپنے شاگردوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ ایک لڑکے کے مقابلے کے لیے یکے بعد دیگرے چند لڑکے میدان میں نکلے لیکن اس کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔ وہ اپنے ہر نئے مد مقابل کو کسی نہ کسی داؤ میں لا کر ہار منوالیتا۔ بالآخر ابن عامر نے محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا۔ محمد! تم تیار نہیں ہوئے؟

محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر دبی زبان میں ابن عامر سے کچھ کہا۔

ابن عامر مسکراتا ہوا نعیم کی طرف آیا اور اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بوا۔ تم عبداللہ کے بھائی ہو؟

جی ہاں۔

اس لڑکے سے مقابلہ کرو گے؟

جی مجھے اتنی زیادہ مشق نہیں اور پھر وہ مجھ سے بڑا بھی ہے۔

کوئی حرج نہیں۔

لیکن میرا بھائی کہاں ہے؟

وہ بھی یہیں ہے۔ تمہیں اس سے ملائیں گے۔ پہلے اس کے ساتھ مقابلہ کر

کے دکھاؤ!

نعیم جھجکتا ہوا میدان میں آیا۔ تماشائی جو پہلے خاموش کھڑے تھے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔

دوتلواریں آپس میں ٹکرائیں اور ان کی جھنکار آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی کچھ دیر نعیم کا مد مقابل اسے کم سن سمجھ کر فقط اس کے وار روکتا رہا لیکن نعیم نے اچانک پینترا بدلا اور اس قدر تیزی سے ساتھ وار کیا کہ وہ اس غیر متوقع وار کو بروقت نہ روک سکا اور نعیم کی تلوار اس کی تلوار پر سے پھلستی ہوئی اس کی خود سے ٹکرا گئی۔ تماشاہیوں نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے۔

نعیم کے مد مقابل کے لیے یہ بات بالکل نئی تھی۔ اس نے غصے کی حالت میں چند اور وار شدت کے ساتھ کیے اور نعیم کو پیچھے دھکینا شروع کیا۔ چند قدم پیچھے پٹنے کے بعد نعیم کا پاؤں ڈگمگایا اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔

نعیم کا مد مقابل فاتحانہ انداز میں تلوار نیچے کر کے اس کے دوبارہ اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ نعیم غصے کی حالت میں اٹھا اور تیغ زنی کے تمام اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی تندی اور تیزی سے اس پر وار کرنے لگا۔ نعیم کو سپاہیانہ رسوم سے باہر جاتا دیکھ کر اس نے پوری طاقت کے ساتھ تلوار گھما کر وار کیا۔ نعیم نے یہ وار اپنی تلوار پر روکنے کی کوشش کی لیکن تلوار اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر چند قدم دُور جا گری۔ نعیم پریشان سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ محمد بن قاسم اور ابن عامر مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ ابن عامر نے ایک ہاتھ اپنے شاگرد اور دوسرا ہاتھ نعیم کے کندھے پر رکھتے ہوئے نعیم سے کہا۔ آؤ اب تمہیں تمہارے بھائی سے

ملائیں۔

جی ہاں! کہاں ہیں وہ؟

ابن عامر نے دوسرے لڑکے کا خود اتار تے ہوئے کہا ادھر دیکھو!

نعیم بھائی بھائی! کہتا ہوا عبداللہ سے لپٹ گیا۔ عبداللہ کو انتہائی پریشانی کی حالت میں دیکھ کر محمد بن قاسم نے نعیم کا خود اتار دیا اور کہا۔ عبداللہ! یہ نعیم ہے۔ کاش یہ میرا بھائی ہوتا۔

(۴)

صابرہ کے لالہ ابن عامر جیسے مشفق استاد کے سایہ میں ایک غیر معمولی رفتار سے رُوحانی، جسمانی اور فنی ترقی کر رہے تھے۔ مکتب میں عبداللہ کا نام سب سے پہلے آتا لیکن اکھاڑے میں نعیم سب سے اول رہتا۔ محمد بن قاسم کبھی کبھی اکھاڑے میں آتا اور نعیم کو بعض باتوں میں اس کی برتری کا اعتراف کرنا پڑتا۔

محمد بن قاسم کو تیغ زنی میں زیادہ مہارت تھی۔ نیزہ بازی میں دونوں ایک جیسے تھے، تیر اندازی میں نعیم سبقت لے جاتا۔ محمد بن قاسم بچپن ہی میں اپنے آپ کو ان خصائل کا مالک ثابت کر چکا تھا جو بعض لوگوں کو ہر ماحول میں ممتاز رکھتے ہیں۔ ابن عامر کہا کرتا تھا کہ وہ کسی بڑھے کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

عبداللہ اور نعیم کے ساتھ محمد بن قاسم کی دوستی کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ بظاہر محمد بن قاسم کی نظروں میں وہ دونوں ایک جیسے تھے لیکن عبداللہ خود اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ نعیم اس سے زیادہ قریب ہے۔ نعیم کو مکتب میں داخل ہوئے ابھی آٹھ مہینے

گزرے تھے کہ محمد بن قاسم فارغِ تحصیل ہو کر فوج میں شامل ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے جانے کے بعد مکتب میں نعیم کا ایک اور جوہر نمایاں ہونے لگا۔ اس مدرسے کے طلباء ہفتہ میں ایک بار کسی نہ کسی موضوع پر مناظرہ کیا کرتے تھے۔ کوضوع ابنِ عامر خود تجویز کرتے۔ نعیم نے بھی اپنے بھائی کو دیکھا دیکھی ایک مناظرے میں حصہ لیا لیکن وہ پہلے مناظرے میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ کر گھبرا گیا ور کھسپانا سا ہو کر ممبر سے اتر آیا۔ لڑکوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ابنِ عامر نے اسے تسلی دی لیکن وہ سارا دن مغموم رہا اور رات بھی کروٹیں بدلتے گزرا دی۔ علیٰ صبح وہ بستر سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ دوپہر تک ایک کھجور کے سائے تلے بیٹھ کر اپنی تقریر رٹا ہوا۔ اگلے ہفتے اس نے پھر مناظرے میں حصہ لیا اور ایک پُر جوش تقریر سے سامعین کو محو حیرت کر دیا۔ اس کے بعد اس کی جھجک جاتی رہی اور اب بے تکلفی سے ہر مناظرے میں حصہ لینے لگا۔ اکثر مناظروں میں عبداللہ اور نعیم دونوں شامل ہوتے۔ ایک بھائی موضوع کے حق میں تقریر کرتا تو دوسرا اس کی مخالفت کرتا۔ شہر کے وہ لوگ جو اس کے جوہر دیکھ کر گرویدہ ہو چکے تھے۔ اس کی تقریروں میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ ابنِ عامر نعیم کی رگوں میں سپاہیانہ خون کی حرارت کے علاوہ اس کے دل و دماغ میں ایک غیر معمولی مقرر کی صلاحیت بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے ہونہار شاگرد کے اس جوہر کی تربیت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ وہ چند تقریروں سے نہ صرف اپنے مدرسے کا بہترین مقرر سمجھا جانے لگا بلکہ بصرہ کی گلیوں میں بھی اس کی جادو بیانی کے چرچے ہونے لگے۔

ابنِ عامر کے شاگردوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا لیکن اس کے بلند ارادوں کی تکمیل کے راستے میں بڑھاپا اور خرابی صحت بُری طرح حائل ہو رہے

تھے۔ اس نے والی بصرہ سے درخواست کی مدرسہ میں ایک تجربہ کار استاد کی ضرورت ہے۔ والی بصرہ کو اس کام کے لیے سعید سے زیادہ جوان دنوں والی قبرص تھا، اور کوئی آدمی موزوں نظر نہ آیا۔ حجاج نے دربار خلافت میں درخواست کی اور وہاں سے سعید کو فوراً بصرہ پہنچ جانے کا حکم صادر ہوا۔

نعیم اور عبداللہ کو اس بات کا علم تھا کہ ایک نیا استاد آ رہا ہے لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ ان کا ماموں ہے۔ سعید قبرص کے ایک نو مسلم گھرانے کی لڑکی کے ساتھ شادی کر چکا تھا۔ وہ اپنی بیوی سمیت پہلے صابرہ کے پاس پہنچا اور چند دن وہاں رہ کر بصرہ چلا آیا۔ مکتب میں آتے ہی اس نے پوری تن دہی سے کام شروع کر دیا۔ اسے یہ معلوم کر کے بیحد مسرت ہوئی کہ اس کے بہترین شاگرد اس کے اپنے بھتیجے ہیں۔

چند مہینوں کے بعد عبداللہ اپنی جماعت کے چند اور نو جوان طلباء کے ساتھ فارغ التحصیل ہو گیا۔ جب ان طلباء کو رخصت کرنے کا دن آیا تو ابن عامر نے حسب معمول الوداعی جلسہ منعقد کیا۔ والی بصرہ نے بھی اس جلسے میں شرکت کی۔ طلباء کو دربار خلافت کی طرف سے گھوڑے اور اسلحہ جات تقسیم کیے گئے۔

ابن عامر نے الوداعی خطبہ دیتے ہوئے کہا:

نو جوانو! اب تمہارا حوالہ کی دنیا میں قدم رکھنے کا وقت آپہنچا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میں سے ہر ایک ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے اس وقت ان تمام باتوں کے دہرانے کی ضرورت نہیں جو تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں فقط اپنے چند الفاظ ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ نو جوانو! زندگی ایک مسلسل جہاد ہے اور ایک مسلمان کی زندگی کا مبارک ترین فعل یہ ہے کہ وہ پانے آقا و مولا کی

محبت میں اپنی جان تک پیش کر دے۔ جب تک تمہارے دل اس مقدس جذبے سے سرشار رہیں گے تمہیں اپنی دنیا اور آخرت دونوں روشن نظر آئیں گی۔ تم دنیا میں سربلند و ممتاز رہو گے اور آخرت میں بھی تمہارے لیے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔ یاد رکھو، جب اس جذبے سے تم محروم ہو جاؤ گے تو دنیا میں تمہار کوئی ٹھکانہ ہوگا اور آخرت بھی تمہیں تاریک نظر آئے گی۔ کمزوری تمہارا دامن اس طرح پکڑے گی کہ تم ہاتھ پاؤں تک نہ ہلا سکو گے، کفر کی وہ طاقتیں جو مجاہدوں کے راستے میں ذروں سے بھی زیادہ ناپائیدار ہیں۔ تمہیں پتھر کی مضبوط چٹانیں دکھائی دیں گی۔ دنیا کی عیار قو میں تمہیں مغلوب کر لیں گی اور تم غلام بنا دیے جاؤ گے اور استبدادی نظام کے ایک ایسے طلسم میں جکڑ دیے جاؤ گے کہ تمہارے لیے اس سے نجات پانا ناممکن ہو جائے گا۔ تم اس وقت بھی اپنے آپ کو مسلمان تصور کرو گے لیکن تم اسلام سے کوسوں دور ہو گئے۔ یاد رکھو، صداقت پر ایمان لانے کے باوجود اگر تم میں صداقت کے لیے قربانی کی تڑپ پیدا نہیں ہوتی تو یہ سمجھ لینا کہ تمہارا ایمان کمزور ہے۔ ایمان کی پختگی کے لیے آگ اور خون کے دریا کو عبور کرنا ضروری ہے۔ جب تمہیں موت زندگی سے عزیز نظر آئے تو یہ سمجھنا کہ تم زندہ ہو اور جب تمہارے شوقِ شہادت پر موت کا خوف غالب آجائے تو تمہاری حالت اُس مردے کی سی ہوگی جو قبر کے اندر سانس لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

ابنِ عامر نے تقریر کے دوران میں ایک ہاتھ سے قرآن اٹھا کر بلند کیا اور کہا:

یہ امانت آقائے مدنی کو خدائے قدوس کی جانب سے عطا ہوئی اور وہ دنیا میں اپنا فرض پورا کرنے کے بعد یہ امانت ہمارے سپرد کر گئے ہیں۔ حضورؐ نے اپنی زندگی سے ثابت کیا کہ ہم اس امانت کی حفاظت تلوار کی تیزی اور بازو کی قوت کے بغیر نہیں

کر سکتے۔ جو پیغام تم تک پہنچ چکا ہے تمہارا فرض ہے کہ اسے دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دو۔

ابن عامر اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھ گئے ورجاج بن یوسف نے مسئلہ جہاد کو ایک فصیح و بلیغ انداز میں بیان کرنے کے بعد اپنی جیب سے ایک خط نکالتے ہوئے کہا:

یہ خط مرو کے گورنر کی طرف سے آیا ہے، وہ دریائے جیوں کو عبور کر کے ترکستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اس خط میں مزید فوج کا مطالبہ کیا ہے۔ میں فی الحال بصرے سے چند دنوں تک دو ہزار سپاہی روانہ کر رہا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اپنے آپ کو اس فوج میں شریک کرنے کے لیے پیش کرتا ہے؟

اس پر تمام طلباء نے ہاتھ بلند کر دیے۔

حجاج نے کہا:

میں تمہارے جذبہ جہاد کی قدر کرتا ہوں لیکن اس وقت میں صرف فارغ التحصیل طلباء کو دعوت دوں گا۔ میں اس فوج کی قیادت اسی مدرسہ کے ایک ہونہار طالب علم کے سپرد کرنا چاہتا ہوں میں عبد اللہ بن عبد الرحمن کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اس لیے میں یہ خدمت اس کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ میں سے جو نو جوان اس کا ساتھ دینا چاہیں، بیش دنوں میں اپنے گھروں سے ہو کر بصرہ پہنچ جائیں۔

ایثار

صابرہ کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر عذرا کو اپنے سامنے بٹھا لیتی اور اس سے قرآن سنتی۔ عذرا کی آواز کی مٹھاس کبھی کبھی پڑوس کی عورتوں کو بھی صابرہ کے گھر پہنچ لاتی، اس کے بعد صابرہ گاؤں کی چند لڑکیوں کو تعلیم دینے میں مصروف ہو جاتی اور عذرا گھر کے کام کاج سے فرصت حاصل کر کے تیر اندازی کی مشق کیا کرتی۔ ایک روز طلوع آفتاب سے پہلے عذرا حسب معمول قرآن سنا کر اٹھنے کو تھی کہ صابرہ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کچھ دیر محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا:

عذرا میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ اگر تم نہ ہوتیں تو میرے دن بڑی مشکل سے کٹتے۔ اگر تم میری بیٹی بھی ہوتیں تو بھی میں تمہارے ساتھ شاید اس سے زیادہ محبت نہ کر سکتی۔

عذرا نے جواب دیا۔ امی! اگر آپ نہ ہوتیں تو میں۔۔۔۔۔!

عذرا اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

عذرا! صابرہ نے کہا۔

ہاں امی!

صابرہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ باہر کا دروازہ کھلا اور عبداللہ گھوڑے کی باگ تھامے اندر داخل ہوا۔ صابرہ اٹھی اور چند قدم آگے بڑھی۔ عبداللہ نے سلام کیا۔

ماں اور بیٹا ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

بیٹے سے ہٹ کر ماں کی نظر دُور جا پہنچی۔ اس دن سے بیس سال پہلے عبد اللہ کا باپ ایسے ہی لباس میں اور ایسی ہی شکل و صورت کے ساتھ گھر میں داخل ہوا کرتا تھا۔

امی!

ہاں بیٹا۔

آپ پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہی ہیں۔

نہیں بیٹا۔ آج تو مجھے کمزور نظر نہیں آنا چاہیے۔۔۔۔۔ لاؤ میں تمہارا گھوڑا باندھ آؤں۔ صابرہ نے یہ کہہ کر گھوڑے کی بات پکڑ لی اور پیار سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

امی چھوڑیے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عبد اللہ نے ماں کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

صابرہ نے کہا۔ بیٹا تمہارے باپ کا گھوڑا میں ہی باندھا کرتی تھی۔

لیکن میں آپ کو تکلیف دینا گناہ سمجھتا ہوں۔

بیٹا ضد نہ کرو۔ چھوڑو!

عبد اللہ نے ماں کے لہجے سے متاثر ہو کر گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔

صابرہ گھوڑا لے کر اصطبل کی طرف ابھی چند ہی قدم بڑھی تھی کہ عذرا نے

آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا۔

امی چھوڑیے۔ میں باندھ آؤں۔

صابرہ نے عذرا کی طرف محبت آمیز مسکراہٹ سے دیکھا اور کچھ سوچ کر گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دی۔

عبداللہ نے رخصت کے بیس دن گھر پر گزارے۔ گھر کے حالات میں اس نے ایک زبردست تغیر محسوس کیا۔ عذرا جو پہلے بھی اس کے ساتھ کسی حد تک تکلف سے پیش آیا کرتی تھی۔ اب بہت زیادہ شرمانے لگی تھی۔ عبداللہ کی رخصت کا آخری دن بھی آپہنچا۔ لاڈلے بیٹے کے لیے ماں کا بہترین تحفہ اس کے دادا کے زمانے کی ایک خوبصورت تلوار تھی۔

جب عبداللہ گھوڑے پر سوار ہوا تو عذرا نے اپنے ہاتھ کا تیار کیا ہوا ایک رومال صابرہ کو لا کر دیا اور شرماتے ہوئے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ صابرہ نے عذرا کا مطلب سمجھ کر رومال عبداللہ کو دے دیا۔ عبداللہ نے رومال رکھ کر دیکھا، درمیان میں سُرخ رنگ کا ریشمی دھاگے کے ساتھ کلام الہی کے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةً، ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

عبداللہ نے رومال جیب میں ڈال کر عذرا کی طرف دیکھا اور عذرا سے نظر ہٹا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے اجازت چاہی۔

صابرہ نے ماں کے نرم و نازک جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا:

بیٹا! اب تمہیں میری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم کس کی

اولاد ہو، تمہارے آباؤ اجداد کا خون کبھی ایڑیوں پر نہیں گرا۔ میرے دودھ اور ان کے نام کی لاج رکھنا۔

(۶)

عبداللہ کو جہاد پر گئے ایک سال گزر چکا تھا۔ صابرہ پر وہ اپنے چند خطوط سے ظاہر کر چکا تھا کہ وہ غیور ماں کی توقع سے زیادہ ناموری حاصل کر رہا ہے۔ سعید کے خطوط اور بصرہ سے بستی میں آنے جانے والے لوگوں کی زبانی اسے مکتب میں نعیم کے نام کی عزت اور شہرت کی اطلاع بھی ملتی رہتی تھی۔ نعیم کے ایک خط سے صابرہ کو معلوم ہوا کہ وہ عنقریب فارغ التحصیل ہو کر آنے والا ہے۔ ایک دن صابرہ کسی پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ عذرا تیر اور کمان ہاتھ میں لیے صحن میں بیٹھی مختلف اشیا پر نشانے کی مشق کر رہی تھی، ایک کوا اڑتا ہوا عذرا کے سامنے کھجور کے درخت پر بیٹھ گیا۔ عذرا کے سامنے کھجور کے درخت پر بیٹھ گیا۔ عذرا نے تاک کی تیر چلایا لیکن کوا بچ کر اڑ گیا۔ ابھی کوا اڑا ہی تھا کہ دوسری طرف سے ایک اور تیر آیا اور وہ زخمی ہو کر نیچے گر پڑا۔ عذرا حیران ہو کر اٹھی اور کوئے کے جسم سے تیر نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اچانک ایک خیال کے آتے ہی اس کا دل مسرت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر پھاٹک کی طرف دیکھا۔ نعیم گھوڑے پر سوار پھاٹک سے باہر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ عذرا کے چہرے پر حیا اور مسرت کی سرخی دوڑنے لگی۔ وہ آگے بڑھی اور پھاٹک کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ نعیم گھوڑے سے اتر کر اندر داخل ہوا۔

نعیم بصرہ سے لے کر گھر تک بہت کچھ کہنے اور بہت کچھ سننے کی تمنائیں بیدار کرتا ہوا آیا تھا لیکن انتہائی کوشش کے باوجود اچھی ہو عذرا؟ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

عذرا نے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک ثانیہ کے لیے اس کی طرف دیکھا
اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

نعیم نے پھر جرات کی۔ عذرا کیسی ہو؟

اچھی ہوں۔

امی جان کہاں ہیں؟

وہ کسی عورت کی تیمارداری کے لیے گئی ہیں۔

پھر دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش کھڑے رہے۔

عذرا میں تمہیں ہر روز یاد کیا کرتا تھا!

عذرا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں لیکن سپاہیانہ شان میں حسن و جبروت کے مجسمے
کو جبہ بھر کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔

عذرا تم مجھ سے ناراض ہو؟

عذرا جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نعیم کی شاہانہ تمکنت نے اس کی زبان
بند کر دی۔ لائے میں آپ کا گھوڑا باندھ آؤں۔ اس نے گفتگو کو موضوع بدلنے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نہیں عذرا، تمہارے ہاتھ ایسے کاموں کے لیے نہیں بنائے گئے۔ نعیم یہ کہہ کر
گھوڑے کو اصطبل کی طرف لے گیا۔

نعیم تین ماہ گھر رہا اور جہاد پر جانے کے لیے والی بصرہ کے حکم کا انتظار کرتا

رہا۔

گھر پر خلاف توقع اس نے زیادہ خوشی کے دن نہ گزارے۔ شباب کے آغاز نے عذرا اور اس کے درمیان حیا کی ایک ناقابل عبور دیوار حائل کر دی تھی۔ بچپن کے گزرے ہوئے وہ دن جب وہ عذرا کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بستی کے نخلستانوں میں چکر لگایا کرتا تھا اسے ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ کم و بیش یہی حالت عذرا کی تھی۔ نعیم اس کے بچپن کا رفیق سے پہلے سے بہت مختلف نظر آتا تھا۔ ان کے طرز عمل میں تکلف کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔ نعیم اپنے جسم و روح پر ایک قدے اور دل پر ایک بوجھ محسوس کرنے لگا۔ عذرا اس کے سازِ دل پر بچپن ہی سے محبت کا پُرسورنہ بیدار کر چکی تھی۔ نعیم چاہتا تھا کہ اس صحرائی حور کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے لیکن حیا نے اسے منہ کھولنے کی اجازت ہی نہ دی۔ تاہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں محسوس کر رہے تھے۔

نعیم کے گھر آنے کے چار ماہ بعد عبداللہ رخصت پر آیا اور صابرہ کے گھر کی رونق دوبال ہو گئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد نعیم اور عبداللہ ماں کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ عبداللہ اپنے فوجی کارنامے اور ترکستان کے حالات سنا رہا تھا۔ عذرا کچھ دور دیوار کا سہارا لیے کھڑی عبداللہ کی باتیں سن رہی تھی۔ گفتگو کے اختتام پر عبداللہ نے بتایا کہ میں بصرہ سے ہو کر آیا ہوں۔

ماموں سے ملے تھے؟ صابرہ نے پوچھا۔

ملا تھا۔ وہ آپ کو سلام کہتے تھے اور مجھے ایک خط بھی دیا ہے۔

کیسا خط؟

عبداللہ نے جیب سے نکالتے ہوئے کہا:

آپ پڑھ لیں!

تم ہی پڑھ کر سنا دو بیٹا!

امی جان! یہ آپ کے نام ہے۔ عبداللہ نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

صابرہ نے خط لے کر نعیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اچھا بیٹا۔ تم پڑھو!

نعیم نے خط لے کر عذرا کی طرف دیکھا۔ وہ شمع اٹھالائی اور نعیم کے قریب کھڑی ہو گئی۔ خط کی تحریر پر ایک نظر ڈالتے ہی نعیم کے دل پر ایک چرکہ سالگا۔ اس نے ماں کو سنا نا چاہا لیکن خط کی عبارت اس کی زبان پر مہر ثبت کر دی۔ اس نے سارے خط پر جلدی جلدی نظر دوڑائی۔ خط کا مضمون نعیم کے لیے نا کردہ گناہ کی سزا کے حکمنامے سے زیادہ بھیانک تھا۔ اپنے مستقبل کے متعلق تقدیر کا ناقابل تردید فیصلہ ہی پڑھ کر ہوتھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ ایک ناقابل برداشت بوجھ اسے زمین کے ساتھ پیوست کر رہا تھا لیکن مجاہد کی فطری ہمت بروئے کار آئی اور اس نے انتہائی کوشش کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کیا:

ماموں جان نے بھائی جان کی شادی کے متعلق لکھا ہے۔ آپ پڑھ لیں!

یہ کہہ کر اس نے خط والدہ کو دے دیا۔ صابرہ نے شمع کی روشنی کی طرف سرک کر پڑھنا میرے لیے عبداللہ اور نعیم ایک جیسے ہیں۔ ان دونوں میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو عذرا جیسی عالی نسب لڑکی کے مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے عبداللہ اس امانت کا زیادہ حق دار معلوم ہوتا ہے۔ اسے دو ماہ کی

رخصت ملی ہے۔ آپ کوئی مناسب دن مقرر کر کے مجھے اطلاع دیں۔ میں دو دن کے لیے آجاؤں گا۔

آپ مجھ سے زیادہ ان بچوں کی طبیعت سے واقف ہیں۔ یہ خیال رکھیں کہ عذرا کے مستقبل کا سوال ہے۔

(۲)

نعیم کے پرانے خواب کی تعبیر اس کی توقع کے خلاف نکلی۔ ابھی تک اس کا یہی خیال تھا کہ وہ عذرا کے لیے ہے اور عذرا اس کے لیے لیکن ماموں کے خط سے ایک تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا۔

عذرا۔۔۔۔۔ اس کی معصوم عذراء اب اس کی بھانج بننے والی تھی۔ اسے دنیا و مافیہا کی تمام چیزوں میں ایک نمایاں تغیر نظر آنے لگا۔ دل میں رہ رہ کر درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی لیکن جہاں تک ہو سکا اس نے ضبط سے کام لیا اور کسی پر اپنے دل کی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ عذرا کی حالب بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

عبداللہ اور صابرہ نے ان دونوں سے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن نعیم کو اپنے بھائی کا لحاظ تھا اور عذرا صابرہ، سعید اور عبداللہ کے احترام سے مجبور تھی۔ اس لیے دونوں کچھ نہ کہہ سکے اور دل کے انگارے دل ہی میں سلگتے رہے۔

جوں جوں عبداللہ کے مسرت کے دن قریب آ رہے تھے۔ نعیم اور عذرا کے تصورات کی دنیا تاریک ہوتی جاتی تھی۔ نعیم کی سکون نا آشنا طبیعت کو گھر کی چار دیواری ایک قفس نظر آنے لگی۔ وہ ہر شام گھوڑے پر سوار، ہو کر سیر کے لیے بہت دور چلا جاتا اور آدھی آدھی رات تک صحرا میں ادھر ادھر گھومتا رہتا۔

عبداللہ کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ نعیم ایک شب بستی سے باہر اپنے گھوڑے پر سیر کر رہا تھا۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ چاند کی دلفریب روشنی میں صحرا کی ریت پر چھوٹی چھوٹی لہریں چمک رہی تھیں۔ بستی میں عبداللہ کی شادی کی خوشی میں نوجوان لڑکیاں دف بجا بجا کر گارہی تھیں۔ نعیم گھوڑے سے اترا اور ٹھنڈی ریت پر لیٹ گیا۔ چاند ستارے ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا اور سامنے بستی کے نخلستانوں کے دلفریب مناظر نے اسے اپنی معصوم دنیا کے کھوئے ہوئے سکون کے متعلق مضطرب کر دیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا:

میرے سوا کائنات کا ہر ذرہ مسرور ہے۔ میری سرد آہیں ان دستوں کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ اُف، بھائی اور والدہ کی خوشی، ماموں کی خوشی اور شاید عذرا کی بھی خوشی، مجھے رنجیدہ اور مغموم بنا رہی ہے۔ میں بہت خود غرض ہوں۔ لیکن میں خود غرض بھی تو نہیں۔ میں تو بھائی کے لیے اپنی خوشی قربان کر چکا ہوں۔۔۔ لیکن یہ جھوٹ ہے۔ میرے دل میں تو بھائی کے لیے اتنا ایثار بھی نہیں ہے کہ اسکی خوشی میں شریک ہو کر اپنا غم بھول جاؤں۔ میرا رات دن باہر رہنا کسی سے بات نہ کرنا اور سرد آہیں بھرنا ان پر کیا ظاہر کرتا ہوگا! میں آئندہ نہیں کروں گا۔ وہ کبھی میرا چہرہ مغموم نہیں دیکھیں گے۔۔۔۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں، میں دل کی خواہشات پر قابو پاسکتا ہوں، احساسات پر نہیں۔ بہتر ہے کہ میں چند دن کے لیے چلا جاؤں۔۔۔۔۔ ہاں مجھے ضرور جانا چاہیئے۔۔۔۔۔ ابھی کیون نہ چلا جاؤں۔۔۔۔۔ مگر نہیں اس طرح نہیں۔ صبح والدہ سے اجازت لے کر۔

اس ارادے نے نعیم کے دل میں کسی حد تک تسکین پیدا کر دی۔

اگلے دن صبح کی نماز سے فارغ ہو کر والدہ سے چند دنوں کے لیے بصرہ جانے کے اجازت مانگی۔ صابرہ اس درخواست پر حیران ہوئی۔ اس نے کہا:

بیٹا تمہارے بھائی کی شادی ہے۔ تم وہاں کیا لینے جاؤ گے؟

امی، میں شادی سے ایک دن پہلے آ جاؤں گا۔

نہیں بیٹا، شادی تک تمہارے گھر پر ٹھہرنا ضروری ہے!

امی! مجھے اجازت دیجئے۔

صابرہ نے ذرا غصے میں آ کر کہا۔ نعیم میرا خیال تھا کہ تم صحیح معنوں میں ایک مجاہد بیٹے ہو۔ لیکن میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ تمہیں اپنے بھائی کی خوشی میں شریک ہونا گوارا نہیں تم عبداللہ سے حسد؟

حسد! امی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے بھائی سے حسد کیوں ہونے لگا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کی تمام راحتیں اس کی نذر کر دوں۔

بیٹا! خُدا کرے میرا یہ خیال غلط ہو۔ لیکن تمہارا اس طرح خاموش رہنا، بلا وجہ صحرا نورودی کرنا اور کیا ظاہر کرتا ہے؟

امی میں معافی چاہتا ہوں۔

صابرہ نے آگے بڑھ کر نعیم کو گلے لگایا اور کہا؟

بیٹا! مجاہدوں کے سینے فراخ ہوا کرتے ہیں۔

شام کے وقت نعیم سیر کے لیے نہ گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پر

لیٹے لیٹے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ اپنے طرزِ عمل سے جو کچھ والدہ پر ظاہر کر چکا ہوں۔ شاید عبد اللہ پر بھی ظاہر ہو جائے۔ اس خیال نے اس کے گھر سے نکلنے کے ارادے کو اور بھی مضبوط کر دیا۔

آدھی رات کے وقت وہ بستر سے اُٹھا، کپڑے بدلے اور پھر اصطبل میں جا کر گھوڑے پر زین ڈالی۔ گھوڑا لے کر باہر نکلنے کو تھا کہ دل میں کچھ خیال آیا اور گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر صحن میں عذرا کے بستر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

عذرا بھی چند دنوں سے نعیم کی طرح پھر جاگنے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے نعیم کی تمام حرکات دیکھ رہی تھی۔ جب نعیم قریب آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ سو رہی ہے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نعیم دیر تک کھڑا رہا۔ چاند کی روشنی عذرا کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا چاند زمین کے چاند کو گھور رہا ہے۔ نعیم کی نگاہیں عذرا کے چہرے پر اس طرح جذب ہو چکی تھیں کہ اُسے تھوڑی دیر کے لیے گرد و پیش کا خیال نہ رہا۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے پُرسوزا الفاظ میں کہا:

عذرا تمہیں شادی مبارک ہو!۔

نعیم کا یہ جملہ سُن کر عذرا کے جسم پر کچکی طاری ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی کا انبار پھینک رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر کسی غیر مرئی ہاتھ نے زبردستی اس کا منہ بند کر رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اُٹھ کر نعیم کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دے اور پوچھے کہ اس کا قصور کیا ہے؟ اس نے یہ کیوں کہا۔ لیکن دھڑکتے ہوئے دل کی آواز دل ہی میں دبی اور اس نے آنکھیں

کھول کر نعیم کی طرف دیکھنے کی بھی جرات نہ کی۔

نعیم! آپ کہاں جا رہے ہیں؟

عذرا۔۔۔۔۔ تم جاگ اُٹھیں؟

میں سوئی کب تھی۔۔۔ دیکھو نعیم۔۔۔۔۔!

عذرا اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور اپنا فقرہ ختم کیے بغیر آگے بڑھی اور نعیم کے ہاتھ سے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

عذرا مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے جانے دو!

کہاں جاؤ گے نعیم؟ عذرا مدت کے بعد اسے نام سے بلا رہی تھی۔

عذرا میں چند دن کے لیے بصرہ جا رہا ہوں۔

لیکن اس وقت کیوں؟

عذرا تم یہ پوچھتی ہو کہ میں اس وقت یوں جا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں؟

عذرا کو معلوم تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس نے نعیم کے گھوڑے کی بات چھوڑ کر اشک آلود آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

نعیم نے کہا۔ عذرا! شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ میرے دل میں ان آنسوؤں کی کیا قیمت ہے۔ لیکن میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میں خود اُداس رہ کر تمہیں بھی غمگین بناتا ہوں۔ بصرہ میں چند دن رہ کر میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تمہاری شادی سے ایک دو دن پہلے آنے کی کوشش کروں گا۔

عذرا! مجھے اس بات کی خوشی ہے اور تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا ہونے والا شوہر مجھ سے بہتر خوبیوں کا مالک ہے۔ کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ مجھے اپنے بھائی سے کتنی محبت ہے۔ عذرا ان آنسوؤں کو ان پر ظاہر نہ ہونے دینا!

آپ واقعی جارہے ہیں؟ عذرا نے پوچھا۔

میں نہیں چاہتا کہ میرے ضبط کا ہر روز امتحان ہوتا رہے۔ عذرا میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔ جاؤ!

عذرا بغیر کچھ کہے واپس چلی آئی۔ چند قدم چل کر ایک بار نعیم کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ وہ ابھی تک ایک پاؤں رکاب میں ڈال کر عذرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عذرا نے منہ پھیر لیا اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے بستر پر منہ کے بل جا گری اور سسکیاں لینے لگی۔

نعیم گھوڑے پر سوار ہو کر ابھی چند قدم چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے بھاگ کر گھوڑے کی بگ پکڑ لی۔ نعیم مہبوت سا ہو کر رہ گیا۔ اس کے سامنے عبداللہ کھڑا تھا۔
بھائی! نعیم نے حیران ہو کر کہا۔

نیچے اترو! عبداللہ نے بارعرب آواز میں کہا۔

بھائی! میں باہر جا رہا ہوں۔

میں جانتا ہوں۔ تم نیچے اترو!

نعیم گھوڑے سے اترا۔ عبداللہ ایک ہاتھ سے گھوڑے کی باگ اور دوسرے

ہاتھ سے نعیم کا بازو پکڑتے ہوئے واپس مڑا۔ مکان کا احاطے میں پہنچ کر اس نے کہا:

گھوڑے کو اصطبل میں باندھ آؤ!

نعیم کچھ کہنا چاہتا تھا مگر عبداللہ کچھ اس تحکمانہ انداز سے کھڑا تھا کہ اسے مجبوراً اس کا حکم ماننا پڑا۔ وہ گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر پھر بھائی کے قریب آ کھڑا ہوا۔

عذرا بستر پر لیٹی یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی۔ عبداللہ نے پھر نعیم کا بازو پکڑ لیا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے مکان کے ایک کمرے میں چلا گیا۔

عذرا کانپتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور چپکے چپکے قدم اٹھاتی ہوئی اس کمرے تک گئی اور دروازہ کی آڑ میں کھڑی ہو کر عبداللہ اور نعیم کی باتیں سننے لگی۔
شمع جلاؤ! عبداللہ نے کہا۔

نعیم نے شمع جلائی۔ کمرے میں اُون کا ایک بڑا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ عبداللہ نے اس پر بیٹھتے ہوئے نعیم کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بھائی، آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟
کچھ نہیں، بیٹھ جاؤ۔

میں کہیں جا رہا تھا۔

میں تمہیں جانے سے منع نہیں کروں گا۔ بیٹھ جاؤ! تم سے ایک ضروری کام ہے۔ نعیم پریشان سا ہو کر بیٹھ گیا۔ عبداللہ نے ایک صندوق سے کاغذ اور قلم نکالا اور

کچھ لکھنا شروع کیا۔ تحریر ختم کرنے کے بعد عبداللہ نے نعیم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا:

نعیم تم بصرہ جا رہے ہو؟

نعیم نے جواب دیا۔ بھائی یہ معلوم نہ تھا کہ آپ جاسوس بھی ہیں۔

میں معافی چاہتا ہوں نعیم، میں تمہارا نہیں عذرا کا جاسوس تھا۔

بھائی جان! آپ عذرا کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں۔

عبداللہ نے اس کا جواب ٹٹکنگی باندھ کر نعیم کے چہرے کی طرف دیکھا، نعیم نے جواب قدرے مرعوب ہو کر گردن جھکالی۔ عبداللہ نے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی کو پیار سے اُپر اٹھایا اور کہا:

نعیم میں تمہارے اور عذرا کے متعلق کچھ غلط اندازہ نہیں لگا سکتا۔ تم بصرہ جاؤ اور میرا یہ خط ماموں کے پاس لیتے جاؤ۔ یہ کہہ کر عبداللہ نے نعیم کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا خط دے دیا۔

بھائی جان! آپ نے کیا لکھا ہے۔

خود ہی پڑھ لو۔ میں نے اس خط میں تمہارے لیے ایک سزا تجویز کی ہے۔

نعیم نے خط پڑھا۔

پیارے ماموں! السلام علیکم،

چونکہ عذرا کا مستقبل آپ کی طرح مجھے بھی عزیز ہے۔ اس لیے مجھے اپنی

نسبت نعیم کو اس کے مستقبل کے محافظ اور امانت دار ہوتے دیکھ کر زیادہ تسکین ہوگی۔
 زیادہ کیا تحریر کروں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے یہ خط کیوں لکھا۔ امید ہے کہ آپ
 میرے بات پر توجہ دیں گے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری رخصت ختم ہونے سے
 پہلے نعیم اور عذرا کی شادی کر دی جائے۔ موزوں تاریخ آپ خود متعین کر دیں۔
 آپ کا عبداللہ۔

خط ختم ہونے تک نعیم کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔ اس نے کہا۔ بھائی میں
 یہ خط نہیں لے جاؤ گا۔ عذرا کی شادی آپ ہی کے ساتھ ہوگی۔ بھائی مجھے معاف کر
 دو۔ عبداللہ نے کہا۔ تمہارا خیال ہے کہ میں اپنی خوشی کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کی
 زندگی بھی کی خوشی قربان ہونے دوں گا؟

آپ مجھے زیادہ شرمسار نہ کریں۔

میں تمہارے لیے تو کچھ نہیں کر رہا۔ نعیم تم سے زیادہ مجھے عذرا کی خوشی کا خیال
 ہے۔ مجھے تمہارا جوڑا پہلے بھی معلوم ہوتا تھا۔ جو کچھ تم میرے لیے کرنا چاہتے تھے
 وہی کچھ میں عذرا کے لیے کر رہا ہوں۔ جاؤ! اب صبح ہونے والی ہے۔ کل تک ضرور
 واپس آ جانا شاید ماموں جان تمہارے ساتھ ہی آجائیں۔ چلو!۔

بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گا!

نعیم اب ضد نہ کرو۔ عذرا کو خوش رکھنے کا فرض ہم دونوں پر عاید ہوتا ہے۔

بھائی۔۔۔۔۔!

چلو! عبداللہ نے ذرا تیور بدلتے ہوئے کہا اور نعیم کا بازو پکڑ کر کمرے سے باہر

لے آیا۔

عذرا انہیں آتے دیکھ کر وہاں سے کھسک آئی اور اپنے بستر پر جا لیٹی۔ نعیم کو متذبذب دیکھ کر عبداللہ خود جا کر اصطلبل سے نعیم کا گھوڑا لے آیا۔ دونوں بھائی مکان سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر بعد عذرا کو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

عبداللہ واپس آ کر بارگاہِ ایزدی میں شکر گزاری کے لیے کھڑا ہو گیا۔

علی الصباح صابرہ نعیم کا بستر خالی دیکھ کر اصطلبل کی طرف گئی۔ عبداللہ وہاں اپنے گھوڑے کے آگے چارہ ڈال رہا تھا۔ صابرہ کو وہاں نعیم کا گھوڑا نظر نہ آیا تو پریشان سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ عبداللہ اس کا مطلب بھانپ گیا۔ اس نے کہا:

امی! آپ نعیم کو تلاش کر رہی ہیں؟

ہاں ہاں کہاں ہے وہ؟

وہ ایک ضروری کام کے لیے باہر گیا ہے۔ عبداللہ نے جواب دیا اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد صابرہ سے سوال کیا۔ امی نعیم کی شادی کب ہوگی؟

امی! میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی مجھ سے پہلے ہو!

بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ تم اسے بہت پیار کرتے ہو۔ میں غافل نہیں ہوں۔ اس کے لیے بھی کوئی رشتہ تلاش کر رہی ہوں۔ خدا کرے کوئی عذرا جیسی لڑکی مل جائے۔

امی عذرا اور نعیم بچپن ہی سے ایک دوسرے کے ساتھی رہے ہیں۔

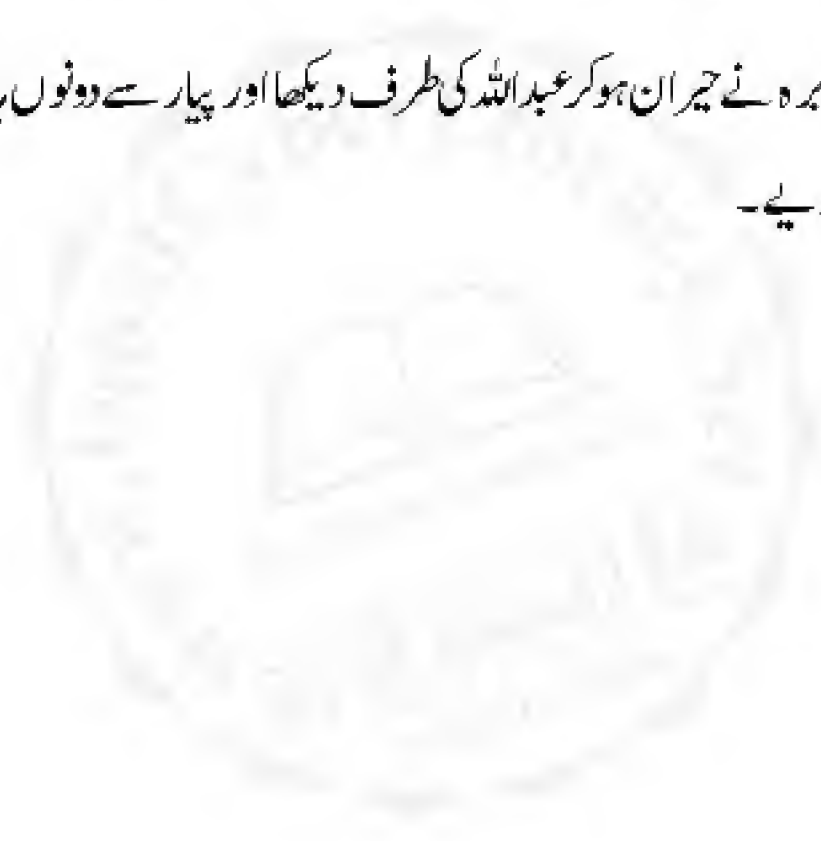
ہاں بیٹا!

امی جان! میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ اکٹھے رہیں۔

تمہارا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔!

ہاں، میں چاہتا ہوں کہ عذرا کی شادی نعیم کے ساتھ کر دی جائے!

صابرہ نے حیران ہو کر عبد اللہ کی طرف دیکھا اور پیار سے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے۔



دوسرا راستہ

شہر بصرہ میں داخل ہوتے ہی نعیم کو اس کا ایک ہم مکتب ملا جس کا نام طلحہ تھا۔ اس کی زبانی نعیم کو معلوم ہوا کہ شہر کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ابن عامر کی صدارت میں ایک زبردست جلسہ ہونے والا ہے۔ مسلمان سندھ پر حملہ کرنے والے ہیں اور افواج کی قیادت محمد بن قاسم کے سپرد کی گئی ہے۔ حجاج بن یوسف بصرہ کے لوگوں کو جہاد کی طرف مائل کرنے کا فرض ابن عامر کے سپرد کر کے خود کوفہ کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی غرض سے روانہ ہو چکا ہے۔ بصرہ میں شہر میں ابن صادق، ایک نام نہاد درویش آیا ہوا ہے اور اس کی شریعت پسند جماعت کے چند آدمی خفیہ خفیہ سندھ کے خلاف اعلان جہاد کی مخالفت کر رہے ہیں۔ بصرہ میں یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جلسہ میں شریک ہو کر کوئی خطرناک صورت حال پیدا نہ کر دیں۔

نعیم طلحہ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچا اور گھوڑے کو وہاں چھوڑ کر دونوں مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ مسجد میں اس دن معمول سے زیادہ رونق تھی۔

نماز کے بعد ابن عامر تقریر کے لیے ممبر پر کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ باہر سے دو ہزار آدمیوں کی ایک جماعت شور مچاتی ہوئی داخل ہوئی۔ ان کے آگے آگے ایک جسم شخص سیاہ رنگ کا جبہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر سفید عمامہ اور گلے میں موتیوں کا بیش قیمت ہار لٹک رہا تھا۔ طلحہ نے نو وارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھیے۔ وہ ابن صادق ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ جلسے میں ضرور کوئی ہنگامہ پیدا کرے گا۔

ابن صادق نعیم سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور اس کی دیکھا دیکھی پیچھے آنے والی جماعت بھی ادھر ادھر دیکھ کر بیٹھ گئی۔

ابن عامر نے ان لوگوں کے خاموشی سے بیٹھ جانے کا انتظار کیا اور بالآخر اپنی تقریر شروع کی: فدایانِ رسولؐ کے غیور بیٹو! دُنیا گزشتہ اسی یا نوے برس میں ہمارے آباؤ اجداد کی غیرت و شجاعت، صبر و استقلال، جبر و سطوت کا امتحان کر چکی ہے۔ اس زمانے میں ہم نے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ بڑے بڑے جاہل اور مغرور بادشاہوں کو نیچا دکھایا۔ ہمارے اقبال کی داستانیں اس وقت سے شروع ہوتی ہیں جب کہ کفر کی آندھیاں شمع رسالت کے پروانوں کو فنا کر دینے کی نیت سے مدینہ کی چار دیواری کی طرف بڑھ رہی تھیں اور ہوتین سو تیرہ فدایانِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مقدس خون سے شاداب کرنے کی نیت سے کنار کے تیروں، نیزوں اور تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس عظیم فتح کے بعد ہم تو حید کا پرچم اٹھا کر کفر کے تعاقب میں نکلے اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے۔ لیکن ابھی تک اس وسیع زمین پر بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں ابھی تک خدا کا آخری پیغام نہیں پہنچا۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے آقا و مولا کا پیغام دنیا کے ہر ملک میں پہنچا دیں اور جو قانون وہ اپنے ساتھ لائے تھے، دُنیا کے تمام انسانوں پر نافذ کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ قانون ہے جس کی بدولت دنیا کی کمزور اور طاقت ور اقوام مساوات کے ایک وسیع دائرہ میں لائی جاسکتی ہیں۔ جس کی بدولت مظلوم و بے کس انسان اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لے سکتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ آج تک دُنیا میں جو طاقتیں عظیم الشان اور عالم گیر قانون کے مقابلے میں اُنھیں کچل دی گئیں۔

مسلمانو! میں حیران ہوں کہ سندھ کے راجہ کو ہمارے غیرت کے امتحان کی جرات کیونکر ہوئی؟ اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مسلمان خانہ جنگیوں کے باعث اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی ہتھیاریوں کی توہین خاموشی سے برداشت کر لیں گے۔
مجاہدو! تمھاری غیرت کے امتحان کا وقت ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنے دل میں انتقام کا جذبہ لے کر اٹھو۔ ہم سندھ کے راجہ کو معاف کر سکتے ہیں لیکن ہم اسلام مساوات کے علم بردار ہو کر ہندوستان کی مظلوم قوموں پر اس کی استبدادی حکومت گوارا نہیں کر سکتے۔ راجہ داہر نے چند مسلمانوں کو قید کر کے ہمیں سندھ کے لاکھوں انسانوں کو اس کے ہتھیاریوں سے نجات دلانے کی دعوت دی ہے۔

مجاہدو اٹھو اور فتح کے نثارے بجاتے ہوئے ہندوستان کی آخری حدود تک پہنچ جاؤ!

ابن عار کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ابن صادق اپنی جگہ سے اٹھا اور بلند آواز میں پکارا:

مسلمانو! میں ابن عامر کو اپنا بزرگ خیال کرتا ہوں، مجھے ان کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں لیکن میں اس بات پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایسا نیک سیرت انسان بھی حجاج بن یوسف جیسے ہوس پرست انسان کا آلہ کار بن کر تمہارے سامنے امن عالم کو تہہ وبالا کرنے کی خطرناک تجاویز پیش کر رہا ہے۔

حجاج بن یوسف کے گزشتہ مظالم کی وجہ سے اہل بصرہ کی اکثریت اس کے خلاف تھی وہ مدت سے کسی ایسے شخص کے متلاشی تھے جس میں علی الاعلان اس کے خلاف کچھ کہنے کی جرات ہو۔ وہ حیران ہو کر ابن صادق کی طرف دیکھنے لگے۔